ماہنامہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

NOVEMBER 1985

MONTHLY HAYAT - E - NAU NOV. 198

BILARIAGANJ AZAMGARH (U.P.)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

★ انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

حیاتِ نو

نومبر ۸۵ء

مدیر مسئول — ابو المکارم فلاحی

مدیر — طارق فار قلیط فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

قیمت فی شمارہ: ۲ روپے ۵۰ پیسے

سالانہ زر تعاون ۲۵ روپے

ترسیل زر کا پتہ: جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ یوپی

"نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ فیض آباد"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقوشِ حیاتِ نو

صفحہ

اداریہ

رحمتوں اور برکتوں کی مستحق یہ قوم ؟! ——— ایڈیٹر ٢

مقالات

عربی ادب اور مختلف ادوار میں اس کا ارتقاء ——— محمد صلاح الدین عمری ٧

البارودی مصر کا ایک عظیم شاعر و مفکر ——— احتشام الحسن مجاہد رسالک اسکالر، اے ایم یو علیگڑھ ٢٠

حضرت مجزاۃ بن ثور سدوسی رضی اللہ عنہ ——— ابو جاوید ٢٢

انٹرویو

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی ——— محمد صلاح ایڈیٹر تکبیر ٣١

تصویرِ انجمن

اجلاس شوریٰ ——— نور محمد فلاحی ٤٢

تاثرات، تعارف و تبصرہ

بزم سلیمان تاج المساجد بھوپال — ایک تاثراتی مکتوب ——— عبیداللہ فہد فلاحی ٥١

آئینہ احساس ——— آل ہم ٥٣

غزل ——— منصف مبارکپوری ٥٥

غزل ——— انور خان انور ٤٨

جامعہ کے لیل و نہار ——— ٹی ایف فلاحی ٥٦

اداریہ

رحمتوں اور برکتوں کی مستحق یہ قوم ؟!

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کی تاریخ میں ١٩ ستمبر [illegible]ء کا دن خوشگوار نتائج کا حامل شمار کیا جائے گا کیونکہ اس دن شوریٰ کے ممبران دور دراز علاقوں سے تشریف لائے۔ سر جوڑ کر بیٹھے۔ انجمن کے مسائل اور مشکلات پر غور و خوض کئے۔ اور اسے متحرک اور فعال بنانے کیلئے مختلف فیصلے کئے۔ اپنے بھرپور اتحاد اور عزم و ہمت سے اس پر چھائی ہوئی مایوسی کو دور کیا اور اسے ایک نیا عزم سفر دیا۔

صدر انجمن جناب نسیم احمد غازی، جناب شبیر احمد فلاحی، جناب مقبول احمد فلاحی، جناب عبدالسلام فلاحی، جناب عبیداللہ فہد فلاحی، جناب نور محمد فلاحی، سکریٹری جناب انصار احمد فلاحی، خازن جناب مطیع اللہ فلاحی، جناب عمران احمد فلاحی اور خاکسار شریک اجلاس ہوئے۔ جناب ابوالکلام فلاحی اور جناب امیر حسن فلاحی تشریف نہ لاسکے۔

یہ شوریٰ خاص طور سے حیات نو کیلئے بلائی گئی تھی۔ چنانچہ ٢٠ کی رپورٹ حیات نو پر گفتگو ہوتی رہی۔ [illegible] توسیع و اشاعت، کتابت و طباعت، معیاری مضامین کی فراہمی تمام مسائل زیر بحث آئے۔ اور کچھ مناسب فیصلے بھی کئے گئے۔ طے کیا گیا کہ شوریٰ کے احباب اپنے حلقہ تعارف میں اس کیلئے کوشش کریں گے۔

- علی گڑھ اور دہلی کے لئے جناب مقبول احمد فلاحی نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ جناب عبیداللہ فہد صاحب ان کے معاون ہوں گے۔ (یہ دورہ ٩ تا ١٢ نومبر ہوگا)
- کانپور کی ذمہ داری جناب شبیر احمد فلاحی پر ڈالی گئی۔
- الہ آباد کا علاقہ جناب عبیداللہ فہد فلاحی کے سپرد کیا گیا۔
- بریلی کا علاقہ جناب عبدالسلام صاحب کے حصہ میں آیا۔
- مدھیہ پردیش کو نور محمد فلاحی نے اپنے لئے منتخب کیا۔
- گورکھپور کا علاقہ جناب مطیع اللہ صاحب فلاحی کیلئے چھوڑ دیا گیا اور طے کیا گیا کہ بلریا گنج کے احباب شوریٰ اعظم گڑھ اور اس کے قریب و جوار میں وقتاً فوقتاً نکل جائیں گے اور توسیع کیلئے بھرپور کوشش کریں گے۔

اللہ تعالیٰ ان کوششوں میں برکت دے۔ آمین

شوریٰ کا اجلاس ابھی جاری ہی تھا کہ مجھے
ایک مختصر پروگرام کے تحت لکھنؤ جانا پڑا۔ بارش اور
سیلاب کی وجہ سے راستہ کافی دشوار گذار و مشکل ہو
گیا تھا۔ بسوں کی آمد و رفت معطل تھی صرف ریل
گاڑیاں چل رہی تھیں۔ رات بھر فیض آباد مسجد میں
قیام کرنا پڑا۔ ۳ بجے شب ٹرین کے ذریعہ روانہ
ہوا اور ۷ بجے صبح لکھنؤ پہنچا ——
—— لکھنؤ میں گومتی نے عجیب
قیامت برپا کر رکھی تھی۔ آس پاس کے علاقے سیلاب
کی زد میں تھے۔ بعض گھر چھت تک ڈوبے ہوئے
تھے اور بعض آدھی دیوار تک۔ اور بعض کے دروازے
کھلے ہوئے تھے اور اس میں دو دو فٹ پانی
بھرا ہوا تھا۔ لوگ امدادی کیمپوں اور خیموں میں پناہ
گزین تھے —— بعض کھلے ہوئے آسمان کے
نیچے پڑے رہتے تھے۔ جنھیں کئی وقت سے کھانے
کو نہیں ملا تھا۔ اور کتنے تھے جو کئی دن سے سو نہ
سکے تھے۔ سیلاب نے عجیب تباہی مچا رکھی تھی۔
اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ، سڑکوں اور فٹ
پاتھوں پر دوسروں کے رحم و کرم پر پڑے تھے۔
—— کل تک دوسروں کی مدد کرنے والے آج
خود دوسروں کی مدد کے محتاج تھے ——
انسان کی بے بسی پر مجھے ترس آیا۔ سوچنے لگا
انسان مجبور اور بے بس ہے قدرت کی نظر میں ایک ——
تنکے کے برابر بھی نہیں۔ کس طرح دولت، طاقت
اور قوت پا کر اکڑتا اور اتراتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے
کہ اس سے بڑا کوئی ہے ہی نہیں۔ کاش! انسان اپنے
آپ کو جان لیتا اور اپنے مالک حقیقی کو پہچان لیتا
مختلف پارٹیاں اور جماعتیں اپنے اپنے
طور پر ریلیف کا کام کر رہی تھیں۔ ایک جگہ ایک
ٹرک پر نظر پڑی اس پر ایک بڑا سا بینر لگا ہوا تھا
"اپنے سیلاب زدہ بھائیوں کی مدد کیجئے" اس ٹرک
کے ذریعہ جماعت اسلامی کے رفقاء مختلف محلوں
میں دورہ کر کے غلہ، کپڑا اور امداد کی دوسری چیزیں
جمع کر رہے تھے۔ ۲۲ ستمبر کو ۸ بجے اندرا نگر کی
ایک مسجد میں درس قرآن کا پروگرام تھا۔ بعد درس
کے بعد میں نے دیکھا جماعت اسلامی کے رفقاء
اپنے سیلاب زدہ بھائیوں کیلئے ناشتہ تیار کر رہے ہیں
پوریاں بنائی جا رہی تھیں اور پیک کی جا رہی تھیں
میں نے ہر ایک کے دل میں اپنے سیلاب زدہ
بھائیوں کے لئے محبت کا ایک طوفان دیکھا
جو انھیں کسی کروٹ چین نہ لینے دیتا اور وہ ہر آن
اور ہر لمحہ دوڑ دھوپ میں لگے ہوئے تھے۔ خدا نے
ان کے دلوں کو ان کی مدد کیلئے کھول دیا تھا۔
لکھنؤ میں ہمارا قیام ہوا دار منزل دفتر
جماعت اسلامی میں تھا۔ جیسے ہی ہم ۲۱ ستمبر کی
صبح لکھنؤ پہنچے ایک غم انگیز خبر کانوں سے ٹکرائی۔

مولانا سید حامد حسین صاحب ایک کار ایکسیڈنٹ
میں جدہ میں انتقال کر گئے۔ فانا للہ وانا الیہ
راجعون۔
موصوف ملت اسلامیہ کی قیمتی متاع، اسلام
کے بے لوث خادم، جماعت اسلامی کے بیباک لیڈر
بہترین خطیب اور داعی تھے۔ ملت کی صحیح رہنمائی
دین کی دعوت و تبلیغ کے لئے اپنے آپ کو وقف
کر دیا تھا۔ ان کی سب سے بڑی خوبی اسلام
پر ان کا غیر متزلزل یقین تھا۔ وہ ایک مسلم خلیف
اور مومن کامل تھے۔ انھوں نے اسلام کا تعارف
کراتے ہوئے مسلم یا غیر مسلم کسی بھی مجمع میں مداہنت
اور رواداری سے کبھی بھی کام نہیں لیا۔ انھوں نے
بار بار پورے عزم و یقین سے یہ بات دہرائی کہ
ساری دنیا اور سارے انسانوں کی نجات اسلام
کو اپنانے میں ہے —— ہمارے ملک
سے برائیاں دور ہو سکتی ہیں —— خرابیاں مٹ
سکتی ہیں بشرطیکہ ہم اسلام کو اپنا لیں —— ان
کی تقریروں میں اعتماد، یقین، عزم و ہمت، صبر و
استقامت کے لازوال خزانے موجود ہوتے تھے
—— نیز الفاظ میں دریا کی روانی
بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک تھی ——
—— گویا وہ اسلام کے روشن مستقبل کو اپنی
آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں ——
آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔
۲۳ ستمبر کو دلی آگیا۔ حیات نو کی کتابت
و طباعت میں ہو رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ اکتوبر کے شمارہ
کے چند مضامین رہ گئے۔ کاتبوں کی تلاش ہوئی۔
پتہ چلا کہ کچھ تو بمبئی اور کچھ دلی چلے گئے اور کچھ جانے کی
تیاری کر رہے ہیں اور جو رہنے والے ہیں ان کے بھی
تیور بگڑے ہوئے ہیں۔ جیسے تیسے کتابت ہوئی
پروف ریڈنگ کے بعد طباعت کیلئے دیدیا گیا۔
۹ محرم کی شام کو پریس بند ہو گیا اور
ورکر ایک روز کی چھٹی منانے اپنے اپنے گھروں کو
چلے گئے میں تنہا رہ گیا —— جیسے جیسے
وقت گذرتا گیا تنہائی کا احساس شدید ہوتا گیا
—— باہر نکلا تاکہ قوم کا جائزہ لوں کہ محرم کن کن
پہلوؤں سے اثر انداز ہو رہا ہے —— جگہ جگہ تعزیہ
بنایا جا رہا تھا اور کہیں کہیں پر چھوٹے چھوٹے تعزیے
رکھے ہوئے تھے۔ کوئی آواز نہ کوئی ہنگامہ ہر طرف
خاموشی اور سناٹا، سوگوار فضا، ماتمی ماحول جیسے
کسی کی میت رکھی ہوئی ہو اور لوگ [illegible] اپنے
سینوں پر رکھے ہوئے ہوں۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ
میں ایک حقیقی سوگوار ماتمی ماحول میں محرم کے ایام
گذار رہا تھا —— بار بار خیال آتا ہماری
قوم کو حضرت حسینؓ کا اتنا غم کیوں ہے؟ ان کو
شہید ہوئے تو ۱۳۰۰ برس ہو گئے۔ کیا اس دین

سے کہ وہ حضور کے نواسے تھے۔ حضرت فاطمہ کے
لختِ جگر اور حضرت علی کے نورِ نظر تھے۔ یا اس وجہ
سے کہ وہ بھوکے پیاسے اپنے اہل عیال سمیت
عبید اللہ بن زیاد کی ظالم فوجوں کا نشانہ بن گئے
تھے اور ان کی لاش کے ساتھ نہایت نازیبا
سلوک کیا گیا تھا۔ یا اس وجہ سے کہ مسلمانوں کے
بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھ کر حق و باطل کی کشمکش
میں حق کے پشت پناہ بنکر باطل کیلئے ننگی تلوار بن
گئے تھے؟

عشاء کی نماز ختم ہوئی تو یہ سکوت ٹوٹ
گیا۔ ہر طرف آہ و بکا نالہ و شیون سے فضا بوجھل
ہوگئی۔ لاؤڈ اسپیکر پر مرثیے پڑھے جانے لگے اور
آہ حسینؑ! ہائے حسینؑ کی دردانگیز ماتمی آواز
کانوں سے ٹکرانے لگی۔ نیند تو بالکل اڑ گئی۔ رات
بھر کروٹیں بدلتا رہا اور نہ چاہتے ہوئے بھی مرثیہ
کا زیر و بم سنتا رہا۔ آسمان بھی اس فضا سے متاثر
ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا بھی صبر و ضبط کا بندھن
ٹوٹ گیا۔ اور جب تک اہل ماتم مرثیہ پڑھتے
رہے روتے رہے اور سینہ کوبی کرتے رہے
آسمان بھی روتا رہا۔ اس کے رونے سے آنسوؤں
کا ایک سیلاب آگیا۔ اور گلی کوچے اٹ اٹ آئے (?)
کتنی پراسرار تھی فضا! کتنا غم انگیز تھا یہ منظر اور
کتنا ماتم زدہ تھا یہ ماحول کہ میں بیان نہیں کرسکتا

اور ۱۰ محرم الحرام کی شام جب تعزیے
دفن کیے جانے لگے تو پوری قوم ان کے آخری دیدار کے
لیے اُمڈ آئی۔ اور سالار گنج قبرستان انسانوں سے
بھر گیا۔ اب لوگ ہشاش بشاش تھے اور تماشہ
دیکھنے کا ماحول پیدا ہوگیا تھا سیکڑوں برقعہ پوش لڑکیاں
بھی موجود تھیں۔ اور سیکڑوں مسلمان اور غیر مسلم
بوڑھے اور بچے تعزیوں کے حسن و قبح کو دیکھ رہے
تھے میرے ساتھ میرا ایک کاتب دوست۔ عادل
تھا اور میرا ایک رفیق شکیل احمد بھی جو ہفت
روزہ الجماعت الاسلام (?) چھپانے آئے تھے۔ ہم دیر تک
مجمع کو دیکھتے رہے۔ پھر تعزیوں پر نظر پڑی جو دفن کیے
جارہے تھے اور جن کے آگے آگے دس بارہ نوجوانوں
کا ایک گروپ سینہ کوبی کررہا تھا۔ پیٹتے پیٹتے سینہ پر
تھپڑ (?) مارتا اور زبان سے حسین حسین کا ورد کرتا تھا اور ان
تمام کے پیچھے بینڈ باجہ تھا جو مسلسل ماتمی دھن بجائے جا
رہا تھا ______ آج دس پندرہ روز
گذر جانے کے بعد بھی یہ مناظر میرے دل و دماغ پر
چھائے ہوئے ہیں اور بار بار یہ خیال آتا ہے کہ کیا
سینہ کی تڑپانیوں کا یہی صلہ ہے اور خدا کی رحمتوں کی
مستحق یہی قوم ہے؟ اور اگر یہی ہے تو پھر خدا کی غضب کی
مستحق کون سی قوم ہوگی؟ کاش ہماری آنکھوں کی
پٹیاں کھل جاتیں اور ہم خوب و ناخوب پہچان لیتے!

طارق عابد (?) علیگ
۱۲/۱/۱۹۹۵

عربی ادب اور مختلف ادوار میں اس کا ارتقاء

محمد صلاح الدین عمری
65 محمد حبیب ہال
اے۔ ایم۔ یو۔ علیگڑھ 202001

جس زبان میں دائرہ عمل کی وسعت، کثرتِ استعمال اور اس کی گرامر واضح اور مستحکم بنیادوں پر قائم ہو جس کے الفاظ میں شیرینیت، اعراب میں دلکشی اور اسلوب بیانی میں تاثر اور معانی میں گہرائی اور گیرائی ہو، اس کا تلفظ اور صوتی اثرات موثر ہوں اور اس کا دامن وسیع ہو تو وہ زبان بلا شبہ اہم ترین زبان ہوتی ہے اور ایسی ہی زبان کے نصیب میں مقبولیت کا خاصہ ہوتا ہے اس حیثیت سے جب ہم عربی زبان کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں وہ تمام خوبیاں نظر آتی ہیں جو ایک مقبول اور کارفرما زبان میں ہونی چاہئیں سامی زبانوں کی شاخوں میں عربی زبان سب سے زیادہ منظم، مضبوط اور واضح زبان ہے۔ اس موقع پر ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اس وسیع زبان میں ادب کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی؟ مختلف ادوار میں اس میں کیا کیا ارتقاء ہوا؟ اس کے معنی و مفہوم میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ اور یہ کہ ادب تاریخ کے کن کن ادوار میں گذر کر اور کس قسم کے نشیب و فراز سے ہوتا ہوا اس موجودہ صورت میں ہم تک پہونچا ہے۔ لیکن اس کو مختلف تاریخی ادوار میں مطالعہ کرنے سے قبل ہم یہ دیکھیں گے کہ ادب دراصل ہے کیا؟ اور اس کی صحیح تعریف کن الفاظ میں کی جاسکتی ہے؟ مختلف نقاد اور ماہرین لسانیات نے لفظ ادب کا کیا تجزیہ کیا ہے؟

لفظ ادب کا اشتقاق: لفظ ادب کے سلسلے میں اکثر عربی ماہرین لغت کا یہ خیال ہے اس لفظ کا مادہ "ء، د، ب" ہے، جس کے معنی تیاری، ضیافت یا دعوت کا بلاوا کے ہیں۔

لیکن نولڈیکی (?) جرمنی اور اطالوی مستشرق Orientalist & Nallino پروفیسر نلینو کی اشتقاق کے سلسلے میں یہ رائے ہے کہ یہ لفظ ادب مفرد سے نہیں بلکہ داب کی جمع آداب سے نکلا ہے جو بعد میں تبدیل ہوکر آداب ہوگئی۔ داب کے معنی دستور اور عادت کے ہیں۔ آداب سے ۔ جو جمع کا صیغہ ہے

صیغہ واحد یعنی ادب بنا۔ پروفیسر نلینو کا خیال ہے کہ دأب کی جمع آداب کا استعمال اتنا عام ہوگیا کہ عرب اس جمع کی اصل اور اس میں واقع تبدیلی کو بھلا بیٹھے اور ان کو یہ خیال پیدا ہوگیا کہ آداب میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی اور اس جمع سے انھوں نے اس کا واحد بجائے دأب کے ادب نکال لیا۔ اور ادب عادت و دستور کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اس کے بعد اس کے اصل معنی میں تبدیلی ہوتی رہی۔

لیکن ظاہر ہے پروفیسر نلینو کی یہ رائے محض ایک مفروضہ ہے۔ جس طرح اور بھی ماہرین لغت نے اپنے اپنے مفروضے قائم کیے ہیں۔ ہم قطعی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیا لفظ ادب، آداب جمع دأب کے مشتق ہے یا ادب بمعنی دعوت سے۔

ادب کی لغوی تحقیق

(۱) جمال الدین ابن منظور، 'لسان العرب' میں اس طرح رقم طراز ہیں۔

"ادب ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعہ ادیب و شاعر لوگوں سے تہذیب و شائستگی حاصل کرتا ہے۔ اسے ادب اس لئے کہتے ہیں کہ ادیب عوام الناس کو اچھائیوں کی طرف بلاتا اور برائیوں سے روکتا ہے ادب کے اصل معنی بلانا اور دعوت دینا ہے۔

(۲) ابن درید الجمہرۃ فی اللغۃ میں لکھتے ہیں کہ " ادب کا معنی عمدگی ہے۔ ذوالرمہ نے کہا ہے " ادب علی لباتہا الحوالی" یعنی جن (عورتوں) کے سینوں پر ہار پڑے ہوتے ہیں وہ حسین معلوم ہوتی ہیں۔

(۳) لوئیس معلوف پادری نے المنجد میں لکھا ہے کہ" ادب ایک ایسا اخلاقی ملکہ ہے جو معیوب باتوں سے روکتا ہے۔ دانائی اور خوش طبعی بھی اس کے معنی میں داخل ہیں۔ اس کی جمع آداب ہے ادب کا اطلاق ہر قسم کے علوم و معارف یا ان کے صرف دلچسپ حصہ پر ہوتا ہے۔ ادب بولکر کسی شئے یا کسی شخص کے اصول و قوانین مراد لیتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں۔ ادب الدرس، ادب القاضی وغیرہ

(۴) علامہ جوہری الفارابی کتاب 'الصحاح' میں تحریر کرتے ہیں کہ" ادب کا استعمال دو طرح سے کیا جاتا ہے۔ ایک تو ادب النفس، دوسرا ادب الدرس۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ ادب الرجل یعنی انسان عقلمند ہوگیا تو اسے ادیب اور شاعر کہا جانے لگا۔ میں نے اسے تہذیب دی تو وہ مہذب ہوگیا۔ اور استادب، تادب کے معنی میں آتا ہے۔ کبھی الادب بولکر تعجب و عمدگی مراد لیتے ہیں۔

(۵) ہیتھو آرنالڈ کہتا ہے کہ وہ تمام علم جو کتابوں کے ذریعہ ہم تک پہونچتا ہے ادب کہلاتا ہے۔

(۶) سعید الخوادی الشرتونی اپنی کتاب اقرب الموارد فی فصح اللغۃ والشوارد میں لکھتے ہیں کہ " ادب کے معنی ظرف اور حسن تناول کے ہیں۔ اس کی جمع آداب آتی ہے۔ جس نے خوش طبعی کا مظاہرہ کیا اور کسی چیز کو عمدگی سے حاصل کیا اسے ادیب کہتے ہیں۔ اس کی جمع ادباء آتی ہے۔ ادب فلاناً ادباً۔ اس کو دسترخوان تیار کیا۔ ادب فلاناً، کسی کو دعوت پر بلانا۔ ادّبہ۔ اس کو ادب سکھایا اور اس کو درست کیے۔ تادب بمعنی ادب سکھا۔ استادب بمعنی تادب۔

ادب کی تعریف "تاریخ ادب کے ابتدائی مراحل میں ادب سے مراد وہ علم لئے جاتے ہیں جن کے ذریعہ سے تہذیب نفس کا کام لیا جاتے اور جس کے نتیجہ میں انسان کے اندر اچھے اخلاق، بلند کردار، سیرت حمیدہ اور معاملات میں صفائی و پاکیزگی پیدا ہو۔

عرب مفکرین کا ایک طبقہ ادب کی تعریف یوں کرتا ہے کہ ادب وہ تمام علوم، معارف اور جملہ معلومات پر مشتمل ہے۔ جو انسان تعلیم و تدریس کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ اور اس میں صرف و نحو، علوم بلاغت، امثال و حکم تاریخ و فلسفہ، شعر و نثر، اجتماعیات و سیاسیات سب ہی شامل ہیں۔ ابن قتیبہ نے ادب الکاتب میں ادیب کیلئے ریاضیات اور دیگر صنعتوں کے جاننے کی شرط بھی لگائی ہے۔ علماء ادب اس ضمن میں یہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی ایسا لفظ نہیں جس کے معنی محدود ہوں۔ بلکہ ہر اس فقہ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ انسان اخلاق و آداب کی تعلیم حاصل کرے اور اپنے نفس کو شائستہ بناکر بلندی کردار پیدا کرے۔

مرتضیٰ زبیدی بلگرامی تاج العروس میں ادب کی بحث کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ اس لفظ کا اطلاق علوم عربیہ میں ایک نیا مفہوم ہے اور عجمیوں سے میل جول کے سبب مسلمانوں نے اس لفظ کو وسیع معنی میں استعمال کرنا شروع کردیا حتی کہ لفظ ادب علوم و اخلاق، فنون صنعت سب ہی کو اپنے اندر لے لیتا ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس لفظ کا اطلاق موسیقی، شطرنج، لعب، انجینئرنگ نیز دیگر علوم عرب کے ساتھ ساتھ گفتگوؤں کے اقتباسات، مجلسی باتوں اور کہانیوں پر بھی ہوجاتا ہے۔

علامہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں ادب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " ادب سے مراد زبان کا نحو اور اس کا خلاصہ ہے۔ اور اسالیب عرب کے مطابق نظم و نثر میں عمدگی پیدا کرنا ہے۔" پھر وہ

لکھتے ہیں کہ "عرب جب اس فن کی معنوی تعریف کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ادب عربوں کی شاعری اور انکی تاریخ و اخبار کو محفوظ کرنے نیز ہر علم میں سے کچھ حصہ اخذ کرنے کا نام ہے۔ اور علم سے مراد وہ علوم ہیں جو زبان سے متعلق ہوں یا علوم شرعیہ کے متون یعنی قرآن و حدیث۔ وہ کہتے ہیں کہ اس علم کا مقصد یہ ہے کہ عربی عبارت اور اس کے اسالیب کو سمجھنے کا موقع اور صلاحیت بیدار ہو جائے تاکہ جب کلام عرب سامنے آئے تو اس کا کوئی گوشہ نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکے۔ غالباً اسی بنیاد پر ابن خلدون اپنے مقدمہ میں ادب کی تعریف کے سلسلہ میں اسی طرح لکھتے ہیں کہ "اس فن (ادب) کے اصول و ارکین چار کتابوں میں جمع ہیں۔ یعنی مبرد کی الکامل، ابن قتیبہ کی ادب الکاتب، جاحظ کی البیان والتبیین اور ابو علی قالی بغدادی کی کتاب النوادر۔ ان کے علاوہ سب ہی کتب انہیں چار کتابوں کی تابع اور فروعات ہیں۔

حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں لکھا ہے کہ "یہ لفظ ان تمام معلومات پر بولا جاتا ہے جس کے ذریعہ عربی بولنے اور لکھنے میں ہر قسم کی خطا سے محفوظ رہا جائے۔"

اسی قسم کی تعریف جرجانی نے بھی کی ہے کہ "یہ وہ علم ہے جس کے ذریعہ غلطیوں سے محفوظ رہا جائے۔"

درحقیقت کلام کا وہی حصہ ادب پارہ ہوتا ہے۔ جس میں جذبات و انفعالات کو بیدار کرنے اور ابھار دینے کی صفت پائی جاتی ہو۔ اور وہ منتخب و خوبصورت الفاظ کے ذریعہ دلکش اور حسین و جمیل پیرایۂ بیان میں ادا کیا گیا ہو۔ اسی کو الجید من المنظوم والمنثور یعنی نظم و نثر کا اعلیٰ نمونہ کہا گیا ہے۔ نظم و نثر کا یہ اعلیٰ ترین نمونہ نظم و نثر کی وہ قسم ہے جس کو سن کر یا پڑھ کر انسان کے احساسات و جذبات میں ہیجان برپا ہو جائے اور وہ فرط لذت سے مست و بیخود ہو جائے یا شدت کرب و الم سے دل گرفتہ ہو جائے۔ اس میں اثر اندازی کی وہ کیفیت ہو جو انسان کو موجودہ حالت سے اس عالم میں لیجا کر کھڑا کر دے۔ جہاں سے ادیب یا شاعر اس کو لیجانا چاہتا ہے۔ ہم جب بھی کوئی بہترین تحریر، متاثر کن قصہ یا غزل یا قصیدہ پڑھتے ہیں تو ہمارے قلب پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ ادب پارے ہمارے احساسات، جذبات و خیالات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اسی کیفیت کو ہم لذت اندوزی یا طرب انگیزی اور اثر پذیری سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ ادیب یا شاعر جب کسی واقعہ یا منظر سے متاثر

ہوتا ہے تو اس کے اثرات کو اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتار کر اپنے تجربات کی روشنی میں دلکش الفاظ اور خوبصورت و حسین و جمیل پیرایہ بیان میں ایک ایسا مرقع پیش کرتا ہے جس میں تخیل کی رنگینیاں مبالغہ کی آمیزش سے بھی کام لیا گیا ہوتا ہے۔ اور جب منتخب الفاظ کا یہ حسین مرقع قاری یا سامع کے سامنے آتا ہے تو وہ ہر چیز سے بے خبر ہو کر اس میں کھو جاتا ہے۔ اسی کو الجید من المنظوم والمنثور یا ادب انشائی ادب اور ادب عالیہ کا نام دیا گیا ہے۔ شاید انہیں اثر آفرینیوں کی جانب اشارہ فرماتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "ان من البیان لسحرا" اور "وان من الشعر لحکمۃ"۔ بقول ڈاکٹر سید عابد حسین کے "ادب، شاعر یا ادیب کے ذہن میں سوئے ہوئے خیالات کا نام ہے جو زندگی کی گرمی سے جاگتے ہیں، زندگی کی آنچ میں تپتے ہیں اور زندگی کے سانچے میں ڈھل کر خود زندگی بن جاتے ہیں۔" ادب اپنے دور کی پوری تاریخی اور سچی تصویر بھی ہوتا ہے۔ ہم کسی بھی دور کا ادب پڑھ کر اس عہد کے لوگوں کے اعتقادات، علمی سطح اور انکی علمی قدروں، سیاسی و سماجی حالات کا پورا پورا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

لفظ ادب کی ابتدا کب ہوئی لفظ ادب کو سب سے قبل کس نے اور کب ادا کیا، اس کا کوئی قطعی فیصلہ کرنا انتہائی دقت طلب امر ہے۔ البتہ عربی زبان کی تاریخ میں لفظ ادب کے آغاز کے سلسلے میں جب تحقیق و جستجو کرتے ہیں تو ہمارے سامنے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلے تو یہ ایام جاہلیت کی کوئی عبارت ہم کو ایسی نہیں ملتی جس میں لفظ ادب کا استعمال ہوا ہو۔ ساتھ ہی ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ دور جاہلیت کے بیشتر ادبی نمونے اول تو ضائع ہو گئے۔ دوسرے جو کچھ بھی مواد دور جاہلیت کا ہم تک پہونچا ہے وہ محض بذریعہ حافظہ پہونچا۔ تیسرے جو جاہلی ادب ہم تک پہونچا اس پر بھی مستشرقین اور چند مشرقی نقاد کے مطابق ہم پوری طرح اعتماد نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ان سب حقائق کی روشنی میں قطعی طور پر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لفظ ادب دور جاہلیت میں معروف تھا۔ ہو سکتا ہے، ان ضائع ہونے والے نمونوں کے ساتھ یہ بھی ضائع ہو گیا ہو یا حافظوں سے محو ہو گیا ہو۔

(۲) لیکن جب ہم اور آگے بڑھ کر قرآن میں اس لفظ کو تلاش کرتے ہیں تو بد قسمتی سے یہ لفظ قرآن میں بھی ہم کو نہیں ملتا۔

(۲) البتہ اس سلسلے میں ہم کو اگر کچھ پتہ چلتا ہے تو یہ کہ اس کا مادہ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے۔ اس طرح کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ سے فرمایا "یا رسول اللہ نحن بنو اب واحد و نراک تکلم وفود العرب بما لا نفهم اکثره" یعنی اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آپ وفود عرب سے ایسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں جس کا اکثر حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تو آپ نے فرمایا کہ "ادبنی ربی فاحسن تادیبی و ربیت فی بنی سعد" مجھے میرے رب نے تعلیم دی ہے اور بہترین تعلیم دی ہے (پھر) اور میں نے قبیلہ بنی سعد میں پرورش (ذہنی تو) پائی ہے۔ (قبیلہ بنو سعد حضرت حلیمہ سعدیہ کا خاندان تھا جو قبائل عرب میں فصیح و بلیغ زبان کا حامل سمجھا جاتا تھا) یہاں آپ نے ادبنی کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اس بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لفظ ادب کا مادہ پہلی بار اس حدیث ہی میں وارد ہوا ہے۔ یہاں ادبنی سے مراد تہذیب سے نہ ہو کر علمی یعنی تعلیم کے ہیں۔ جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اوائل اسلام میں تادیب بمعنی تعلیم لئے جاتے ہیں۔ اور مودب بمعنی معلم بولا جاتا ہے۔ لیکن ہنوز ہم یہ ثابت کرنے میں ناکام ہیں کہ لفظ ادب کا استعمال عربی زبان میں یقینی طور پر کب سے ملتا ہے۔ آیئے تاریخ ادب عربی کے ہر دور میں علیحدہ علیحدہ تلاش کریں تاکہ ہم کسی یقینی نتیجہ پر پہونچنے میں کامیاب ہو سکیں۔

ادب کا مختلف ادوار میں ارتقاء ہم جانتے ہیں کہ عربی ادب تاریخ کے مختلف گرم و سرد مراحل اور زمانے کے نشیب و فراز سے گزرتا ہوا موجودہ صورت میں ہم تک پہونچا ہے۔ ان ادوار نے اس کو مستحکم کرنے اور ارتقا کے منازل طے کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس لئے اگر ہم اس کی پوری تاریخ کو مندرجہ ذیل ادوار و مراحل میں تقسیم کریں تو اس کے مطالعہ میں بھی آسانی ہوگی۔ اور کسی غلطی کا احتمال بھی ختم ہو جائے گا۔

۱ زمانۂ جاہلیت (ا) پانچویں صدی عیسوی سے قبل کا زمانہ

(ب) پانچویں صدی عیسوی کے بعد یعنی اسلام سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل سے شروع ہو کر ہجرت نبوی یعنی ۶۲۲ء پر ختم ہو جاتا ہے۔

۲ اسلامی زمانہ (ا) صدر اسلام سنہ ۱ھ مطابق ۶۲۲ء سے ہو شروع ہو کر سنہ ۴۰ھ مطابق ۶۶۱ء تک رہتا ہے۔

(ب) عہد بنی امیہ، حضرت معاویہ کی خلافت سنہ ۴۱ھ مطابق ۶۶۱ء سے شروع ہو کر عباسی سلطنت ۱۳۲ھ مطابق ۷۵۰ء تک رہتا ہے۔

۳ عباسی زمانہ (ا) پہلا دور ترقی و عروج کا زمانہ سنہ ۱۳۲ھ سے ۳۳۴ھ تک (مطابق ۷۵۰ء سے ۹۴۵ء) تک

(ب) دوسرا دور طوائف الملوکی کا زمانہ سنہ ۳۳۴ھ سے ۶۵۶ھ تک (مطابق ۹۴۵ء سے ۱۲۵۸ء) تک۔

ادب زمانۂ جاہلیت میں

لفظ ادب کی تحقیق کے سلسلے میں جب ہم زمانۂ جاہلیت پر غور کرتے ہیں اور تاریخ ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ جاہلی دور کا ادب ہی عربی زبان کا قدیم ترین ادب ہے۔ لیکن ہم کو اپنے اصل مقصد میں کامیابی نہیں ہوتی یعنی لفظ ادب ہم کو اس زمانہ کے ادب میں کہیں بھی نہیں ملتا۔ ساتھ ہی ساتھ ہمارے ذہن میں یہ حقیقت بھی ہے کہ جاہلی ادب کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا۔ اور بہت کم حصہ ہی ہم تک پہونچ سکا ہے۔ نیز یہ کہ جو کچھ ہم تک پہونچا ہے وہ ایک طویل عرصہ تک محض سینہ بسینہ روایت ہوتا رہا۔ اسی اثنا میں بہت سے مذہبی، سیاسی اور اجتماعی حالات میں تبدیلیاں آئیں اور ان میں انقلابات رونما ہوئے۔ جسکی وجہ سے ظاہر ہے۔ ان سینہ بسینہ چلنے والی روایات میں کمی بیشی لازمی ہی ہوئی ہوگی۔ ان میں تبدیلی کا احتمال بھی قوی تر ہے۔ چنانچہ بیشتر مستشرقین اسی بنا پر موجودہ جاہلی ادب کے اکثر حصہ کو موضوع اور منحول قرار دیتے ہیں۔ ان کے اس نظریہ پر بعض مشرقی علماء ڈاکٹر طہ حسین جیسے بھی صاد کرتے ہیں۔ اس میں نعمان نے کسریٰ کو خط لکھا تھا اور نعمان نے کسریٰ کے سامنے جو گفتگو کی تھی اور ان میں ادب اور اس کے متعلقات کا جو تذکرہ ہے محققین اس کی صحت سے بھی انکار کرتے ہیں۔

بالکل اسی قسم کی بات عربی لغت کے سلسلے میں کہی جاتی ہے کہ عربی لغت کی تدوین بہت بعد میں ہوئی۔ اس سے قبل ان لغات کا استعمال زبانی ہی ہوتا رہا۔ اس لئے یہ دعویٰ قطعی طور پر نہیں کیا جا سکتا کہ دور جاہلیت میں جتنے بھی عربی الفاظ استعمال ہوتے تھے وہ سب کے سب عربی لغت کی کتابوں میں درج اور محفوظ ہو گئے ہیں۔

لہٰذا ہم قطعیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ آیا یہ لفظ جاہلی ادب میں موجود تھا یا نہیں کیونکہ جاہلی ادب میں یہ لفظ ہم کو ملتا تو کیسے ملتا لیکن دوسری طرف یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ جس طرح جاہلی ادب کے دیگر نمونے ضائع ہو گئے ہو سکتا ہے یہ لفظ بھی اسی لپیٹ میں آگیا ہو لیکن اس بنا پر کہ لفظ ہم کو زمانۂ جاہلیت میں نہیں ملتا ہم کوئی فیصلہ اس کی نفی میں نہیں کر سکتے۔

ادب صدر اسلام میں

لفظ ادب کے بارے میں زمانہ جاہلیت میں ہم کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اب جب ہم اور آگے بڑھ کر اس کی تلاش صدر اسلام میں کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمارے سامنے قرآن جیسی عظیم کتاب جس کی ادبی حیثیت بھی بہرحال مسلم ہے۔ آتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ لفظ باوجود اپنی خفت و فصاحت کے قرآن میں بھی ہم کو نہیں ملتا۔ البتہ اس لفظ کے معنی و مفہوم آیات قرآنی میں ضرور ملتے ہیں۔ جاہلی دور کے ادبی نمونوں کی طرح اس کتاب کے سلسلے میں کسی شک و شبہ کا اظہار تو کر ہی نہیں سکتے کیونکہ اس کی صحت میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری، غلطی اور نسیان کے پتلے انسان پر نہیں بلکہ خود باری تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔ وہ فرماتا ہے۔ "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" (بیشک قرآن کو ہم نے نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) اس سلسلے میں یہ کہنے کا بھی جواز نہیں کہ چونکہ قرآن میں اس لفظ کا ورود نہیں ہوا اس لئے یہ قریش کی زبان کا لفظ نہیں کیونکہ ضروری نہیں کہ قرآن نے سارے ہی قریشی الفاظ کا احاطہ کیا ہو۔ البتہ اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ لفظ قرآن میں وارد نہیں ہوا۔

قرآن کے بعد جب ہم اپنی توجہ احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ کی جانب مبذول کرتے ہیں تو ہم اپنی جستجو میں کسی قدر کامیاب ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ سے منسوب اقوال و احادیث اور صحابہ کرام کی جانب نسبت کئے جانے والے اقوال میں ہم کو اس لفظ کے مشتقات کے ورود کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً ایک روایت میں اس قسم کے الفاظ آتے ہیں۔ "ادبنی ربی فاحسن تادیبی" یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مجھے میرے رب نے تعلیم دی اور بہترین تعلیم دی) لیکن محققین اس روایت پر تردد اور عدم اطمینانی کا اظہار کرتے ہیں جس کی وجہ یہی ہے کہ انہیں اس کی صحت کی تحقیق کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں مل سکا جس پر وہ یقین کر سکیں۔

لیکن مستشرقین دو وجہوں کی بنا پر اس بات کے امکان کا اظہار کرتے ہیں کہ لفظ عربی الاصل ہے نہ کہ دخیل۔ اول تو یہ کہ لفظ ادب کے معنی سے قریب اور معنی میں مشترک اس جیسے دوسرے الفاظ مثلاً بَدَل، دَأْب اور دَأَب کا پایا جانا۔ ان سب کے مفہوم میں کسی چیز سے تعلق اور اتصال کا مفہوم مشترک ہے جاہلی عربوں کے یہاں اس لفظ کا مفہوم تو پوری طرح رائج تھا لیکن اس لفظ ادب کا اپنی خفت و فصاحت کے باوجود چلن نہیں تھا۔

دوم یہ کہ عربی زبان کی بہنوں اور اسکی قدیم ذیلی زبانوں (سریانی اور عبرانی جیسی سامی زبانوں) میں اس

لفظ کا وجود نہیں تھا۔ اس لئے ممکنات کا قوی گمان ہے کہ یہ لفظ عربی الاصل ہو نہ کہ دخیل۔

کچھ لوگوں نے اس قسم کے خیال کا اظہار کیا ہے کہ لفظ عربی اور دوسری سامی زبانوں میں سومری زبان سے آیا ہے۔ سومری قوم زمانہ قدیم میں جنوبی عراق میں آباد تھی۔ جب سامی اقوام نے وہاں پر اپنا تسلط جمایا تو سومری زبان سے لفظ کو لیکر اپنی زبان میں شامل کر لیا۔ سومری زبان میں اس لفظ کے معنی انسان کے تھے دیگر سامی زبانوں میں داخل ہو کر یہ لفظ ادب سے آدم ہو گیا اور کثرت استعمال سے آگے چل کر آدم میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن عرب چونکہ الگ تھلگ صحرائی زندگی بتا رہے تھے اس لئے عربی میں یہ لفظ اپنی اصل ہیئت پر ہی برقرار رہا۔ اور بعد میں ان کے یہاں اس لفظ کا استعمال اخلاق کریمہ کے معنی میں ہونے لگا جو انسانیت کے معنی میں داخل ہے۔ لیکن اس خیال کی حیثیت ـ ہم سمجھتے ہیں ـ بالکل وہی ہے کہ اندھیرے میں تاک توئیاں مارتے ہوئے کوئی روشنی کی ایک کرن نظر آ جائے۔ اور جب وہ اس کے قریب جائے تو محض نظر کا واہمہ نکلے۔ بالکل اسی طرح اس مفروضے کی کوئی علمی تحقیق نہیں۔

اب جب ہم احادیث رسولؐ اور صحابہ کرامؓ سے منقول اقوال پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں ہم کو ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں جن میں اس لفظ کے مشتقات متعدد معنی اور مختلف نوعیت کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ ان میں ایک حدیث تو وہی ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ ہم ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں لیکن ہم آپ کو بعض وفود عرب سے انکی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے سنتے ہیں جس کا اکثر حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔" جس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ "ادبنی ربی فاحسن تادیبی الخ" یہاں تادیب اور اس کا فعل اَدَّبَ آیا ہے جو متعدی ہے اور جس کے معنی تعلیم کے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ان ھذا القرآن مادبۃ اللہ فی الارض فتعلموا من مادبتہ" (قرآن زمین میں اللہ کا دسترخوان ہے پس تم جتنا چاہو اس کے دسترخوان سے سیکھو) اس میں مادبۃ کا لفظ آیا ہے جو اسم ظرف ہے۔ اور اس کا مادہ ادب ہی ہے۔ اس لفظ کا استعمال یہاں تشبیہ کے طور پر ہوا ہے کہ قرآن ان آداب پر مشتمل ہے جو تزکیہ نفس سے متعلق ہیں۔ اور جن کی جانب خداوند کریم اپنے بندوں کو دعوت دیتا ہے۔

حضرت علیؓ سے ایک اور روایت منقول ہے کہ "اما اخواننا بنو امیۃ فقادۃ ادبۃ" ہم سال

ہاں، بھاگی ہو انیسے مأدُب جو کھانے کی دعوت دینے والے ہیں۔ یہاں پر لفظ اَدبۃ اَدب کی جمع کی شکل میں آیا ہے۔ بعض علماء کے مطابق یہی اس لفظ کے اصل لغوی معنی ہیں۔

اس قسم کے اور بکثرت سے ایسے اقوال ہیں جن سے اس مادہ کی نہ تو پوری طرح نفی کی جا سکتی ہے، اور نہ اس کو پوری طرح سے قبول ہی کیا جا سکتا ہے۔ جدید دور کے لوگ اس کلمہ کے معنی میں غور و فکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ کلمہ جاہلی نہیں ہے۔ نیز یہ کہ یہ کلمہ عہد میں انہیں معنی پر دلالت کرتا رہا جن پر صدر اسلام میں دلالت کر رہا تھا۔ البتہ اس کے معنی میں تھوڑی سی توسیع ضرور ہو گئی۔ اس خیال سے اس نظریہ کو ترجیح ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ عہد رسولؐ، صحابہ کرامؓ اور زمانہ جاہلیت میں بھی معروف تھا۔ اور اس سے عمدہ اخلاق اور وہ آثار مراد لیے جاتے تھے جو عمدہ اخلاق کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

ادب اموی دور میں عہد بنو امیہ کا آغاز ہوا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لفظ اپنی صحیح اور معتبر تاریخ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کا استعمال عام ہو جاتا ہے۔ اس سے متعدد الفاظ مشتق ہو جاتے ہیں۔ اس کے معنی ایک دوسرے سے ممتاز ہو جاتے ہیں اور یہ تعلیم و تربیت کے ایک انوکھے ذریعے کے بطور اصطلاح عام ہونے لگ جاتا ہے اور ممتاز اساتذہ کو ایک پیشہ اختیار آ جاتا ہے۔ جو خلفاء، امراء اور اعلیٰ طبقہ کی اولاد کی تعلیم و تربیت کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اور ان پر مؤدبین کا اطلاق ہوتا ہے۔ مثلاً ابو معبد الجہنی اور عامر شعبیؒ، عبدالملک بن مروان کے بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ صالح بن کیسان عمر بن عبدالعزیز کے بیٹوں کے مؤدب تھے اور جعد بن درہم آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کے مؤدب تھے۔

اس بات کی وضاحت اس دور کی ساری تحریریں کرتی ہیں چنانچہ زیاد نے اپنے مشہور خطبہ بترا میں کہا تھا:

"فادعوا اللہ بالصلاح لأئمتکم فإنہم ساستکم المؤدبون لکم .... أما واللہ لأقودنکم فیہ الی الأدب أو لتستقیمن" (اپنے ائمہ کے واسطے خدا سے اصلاح کی دعا کرو کیونکہ وہ تمہارے مؤدب اور سیاستداں ہیں .... دیکھو خدا کی قسم میں تم کو اس ادب کے علاوہ ادب سکھاؤں گا یا تو تم خود ٹھیک ہو جاؤ")

ان جملوں میں ظاہر ہے۔ لفظ ادب اپنے تہذیبی و اصلاحی معنی میں مستعمل ہوا ہے جس کا تعلق عمدہ اخلاق اور نیک برتاؤ سے ہے۔

عبدالملک بن مروان نے اپنے بچوں کے استاد سے کہا تھا "علّمہم الشعر یمجدوا وینجدوا" (انہیں شعر سکھاؤ تاکہ وہ شریف اور بہادر ہو جائیں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ عبدالملک کے نزدیک تادیب سے تعلیم و تربیت اور تہذیب و اصلاح مراد تھی۔

اسی طرح عمر بن عبدالعزیز نے اپنے استاد سے کہا تھا "کیف کانت طاعتی ایاک وانت تؤدبنی" (جب آپ مجھے تعلیم دے رہے تھے تو میں آپ کی کیسی اطاعت کرتا تھا) استاد نے جواب دیا "احسن طاعۃ" (تم نے بہترین اطاعت کی) پھر عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا "فأطعنی الآن کما کنت اطیعک" (یعنی اب آپ میری ایسی ہی اطاعت کریں جس طرح میں آپ کی کیا کرتا تھا)

یہ مؤدبین نوجوانوں کو شعر و علم الانساب اور اخبار و امثال کی تعلیم دیا کرتے تھے تاکہ ان کی معلومات میں اضافہ ہو۔ اس طرح پہلی صدی ہجری کے ربع آخر میں اس لفظ کے تہذیبی معنی محدود ہو گئے۔ اور یہ دو الگ الگ معنوں میں بولا جانے لگا۔

۱. ایک تو دینی اخلاقی و تہذیبی معنی جس کا مدعی، علم و کرم اور اخلاق و شجاعت جیسے فضائل کیلئے نفس کی تربیت تھی، تاکہ وہ اخلاق فاضلہ کا ادراک کر سکے۔ چنانچہ عبداللہ ابن مقفع نے اپنی کتاب کا نام الادب الصغیر اور الادب الکبیر اسی لئے رکھا تھا کہ اس میں اس نے ایسے اصول و قواعد بیان کئے تھے جن کے اختیار کرنے سے قاری "ادیب" (مؤدب) خوش اخلاق اور نیک سیرت بن سکتا تھا۔

۲. اس کے دوسرے معنی تعلیمی معنی تھے۔ یعنی شعر و نثر کی تعلیم دینا اور انساب و اخبار و امثال وغیرہ سے متعلق روایتیں بیان کرنا تاکہ عقل کے نور و ذوق کی صفائی اور نفس کی ثقافت و عرفان میں اضافہ ہو۔

اس زمانہ سے ادیب یا مؤدب اور شاعر و کاتب میں امتیاز کیا جانے لگا جو شخص ادب کے مطالعہ اور تعلیم میں زیادہ مشغول رہتا اسے ادیب کہا جاتا، اور جو شعر گوئی میں زیادہ منہمک ہوتا اسے شاعر کا لقب ملتا اور جو تحریر لکھتا وہ کاتب کے نام سے پکارا جاتا۔ پھر اس وقت یعنی پہلی صدی ہجری کے آخر تک لفظ ادب انہیں دونوں مذکورہ معانی میں مستعمل ہوتا رہا۔ کبھی ان میں تھوڑی سی وسعت پیدا ہو جاتی اور کبھی تنگی۔ لیکن زیادہ اہم اور معروف دونوں معنی رہے۔ چنانچہ ایک مقولہ مشہور ہے کہ ادب دو ہوتے ہیں، ایک ادب النفس اور دوسرا ادب الدرس۔

ادب عباسی دور میں عباسی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو اس دور میں علوم و فنون کو بھی کافی ترقی حاصل ہوئی۔ نحو، صرف، اللغت جیسے علوم وجود میں آئے اور یہ سب کے سب ادب کے تعلیمی معنی میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ اس لفظ کے معنی میں وسعت پیدا ہوئی۔ اب اس لفظ سے انساب و اخبار کے ساتھ ساتھ نحو و صرف اور نقد و بیان وغیرہ بھی مراد لئے جانے لگے۔ لیکن یہ صورت حال زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ کیونکہ عباسی ثقافت اور سماجی پہلوؤں میں اتنا تنوع رونما ہوا اور تغیرات ظہور پذیر ہوئے کہ تیسری صدی کے آخر تک لفظ ادب مندرجہ ذیل چار معانی میں استعمال ہونے لگا۔

۱۔ ایک تو اس کے خاص معنی تھے جس میں نثر و نظم کے ساتھ اخبار و انساب بھی شامل تھے۔ اور یہ تقریباً وہی معنی ہیں جو پہلی صدی میں اس لفظ سے مراد تھے۔ اس کے علاوہ فنی نثر اور ادبی نقد کا اضافہ بھی اس میں ہو گیا۔ چنانچہ تیسری صدی ہجری میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت متعدد کتابیں ایسی لکھی گئیں جن پر یہی خاص معنی صادق آتے ہیں۔ مثلاً جاحظ کی "البیان والتبیین"، ابن قتیبہ کی "الشعر و الشعراء"، مبرد کی "الکامل" اور جمحی کی "طبقات الشعراء" وغیرہ۔

۲۔ دوسرے اس کے عام معنی جس میں تمام انسانی علوم، علمی آثار اور مختلف قسم کے فنون لطیفہ اور فنون ریاضیہ وغیرہ سب آ جاتے تھے۔ چنانچہ عباسی وزیر حسن بن سہل سے ایک روایت منقول ہے جس میں اس نے ادب کی دس قسمیں بیان کی ہیں۔ اور اس میں شعر و انساب اور ایام و اخبار کے ساتھ ساتھ عود، شطرنج، طب، ہندسہ، شہسواری اور قصہ گوئی سب کو شامل کر لیا ہے۔ اسی طرح کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفہ متقدمین کے نزدیک نجوم، ہندسہ، مساحت، طب و کیمیا اور موسیقی وغیرہ بھی اصول و آداب میں شامل تھے۔

۳۔ تیسرے وہ دینی علوم جنہوں نے مستقل حیثیت اختیار کر لی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس میں جدت پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس دور میں ادیب کے اندر ادبی صلاحیت پیدا کرنے کیلئے لغت، نحو، صرف، نسب اور اخبار وغیرہ لازمی ہو گئے تھے اور یہی مذکورہ علوم عربی ثقافت کے مظہر تھے۔ اسی کے ساتھ دینی ثقافت بھی تھی۔ جس میں مختلف قسم کے علوم اور متعلق ابحاث بھی شامل تھیں۔ مثلاً تفسیر قرآن، علوم حدیث، فقہ اور اصول فقہ اور علم کلام وغیرہ۔ نیز ایک فلسفیانہ ثقافت بھی جو دراصل یونانی، ہندی اور ایرانی وغیرہ دیگر

اقوام سے حاصل ہوئی تھی۔

۴۔ چوتھا ادب النفس ہے۔ اس کے معنی میں اس قدر وسعت پیدا ہوئی کہ علم و عمل، عادات حمیدہ، اخلاق حسنہ پر پسندیدہ اسلوب پر اس کا اطلاق کیا جانے لگا اور اسے مختلف لوگوں نے اپنایا۔ اس زمانہ میں عصری ضرورت کے لحاظ سے کچھ کتابیں بھی تالیف کی گئیں۔ مثلاً امام ابو یوسف کی ادب القاضی، ابن قتیبہ کی ادب القراۃ، سرخسی کی ادب النفس، ماوردی کی ادب الدنیا والدین، اور نیشاپوری کی آداب البحث والمناظرہ۔

ادب چوتھی صدی ہجری میں جب چوتھی صدی ہجری کا آغاز ہوتا ہے تو اس دور میں علوم لغویہ (علم لغت، نحو و صرف وغیرہ) ادب کے معنی سے خارج ہو کر ایک مستقل فن کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اب صرف علم تنقید اور علم بیان ادب سے متعلق رہ جاتے ہیں۔ اس صدی میں علم تنقید میں ایسی سرگرمی پیدا ہوئی کہ اس کے ایک مستقل فن کی شکل اختیار کرنے کے امکانات نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ چنانچہ جلد ہی علم تنقید بھی ایک دوسرا ادبی فن یا علم تسلیم کر لیا گیا، پھر اسی کے نتیجہ میں بلاغت کا ظہور ہوا، جو بعد میں معانی، بیان اور بدیع تین حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

فن تنقید کی ترویج و ترقی اور اسے مستقل حیثیت بخشنے کیلئے اس صدی میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں ابو ہلال عسکری کی کتاب الصناعتین بہت مشہور ہے جس میں مولف نے نثر و شعر دونوں کے فنی محاسن اور ادبی تنقید و بلاغت کے مسائل بیان کئے ہیں۔ اسی ضمن میں اس کی دوسری کتاب "دیوان المعانی" بھی ہے۔ ابن عبد ربہ کی العقد الفرید کو بھی اسی زمرہ میں شمار کرتے ہیں۔ اسی چوتھی صدی میں بحتری (ابو عبادہ) اور ابو تمام کے حامیوں کے درمیان سخت اختلاف رونما ہوا۔ اس کے بعد متنبی اور اس کے حریفوں کے درمیان بھی سخت قسم کا نزاع اٹھ کھڑا ہوا جس سے نقد کو بڑی ترقی حاصل ہوئی۔ چنانچہ آمدی نے "الموازنۃ بین الطائیین" اور عبد القاہر جرجانی "الوساطۃ بین المتنبی و خصومہ" تصنیف کی۔ ان دونوں کتابوں کے ساتھ ساتھ اصفہانی کی الاغانی کا ظہور ہوا۔ اور دوسرے رسائل بھی لکھے گئے۔ جن کی وجہ سے ایک طرف تو نقد کے مستقل فن ہونے کی بنیاد پڑی اور دوسری طرف بلاغت کیلئے راستہ ہموار ہوا۔ چنانچہ پانچویں صدی آتے ہی بلاغت کے زبردست

عالم عبدالقاہر جرجانی کی دو کتابیں "دلائل الاعجاز" اور "اسرار البلاغۃ" وجود میں آئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادب کے عام معنی سے نقد و بلاغت نکل گئے۔ اور صرف اعلیٰ درجہ کی شاعری اور نثر باقی رہ گئی۔

جہاں تک ادب کے معنی کا تعلق ہے اس کی وسعت اس دور میں بھی باقی رہی اور شرعی علوم اور بنیادی فلسفہ کے علاوہ تمام علمی و عقلی آثار بھی اس میں شامل رہے۔ چنانچہ اخوان الصفا کے رسائل جو چوتھی صدی کی تصنیف ہیں، اس کے ساتویں رسالہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم الادب کے اقسام میں کتابت، قرأت، لغت، نحو، حساب، شعر، کیمیا، صنعت و حرفت، تجارت و زراعت اور سیرت و اخبار وغیرہ سے متعلق سارے ہی علوم شامل تھے۔

ادب پانچویں صدی ہجری میں : پانچویں صدی اور اس کے اختتام تک تمام اہم ادبی علوم مستقل حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ اور ادب صرف اعلیٰ نثر اور شعر کے اندر محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ اب اس لفظ کے معنی میں ایک دوسری قسم کی تحدید شروع ہوئی۔

اول یہ کہ اس لفظ کے عام معنی کا دائرہ تنگ ہونے لگا۔ اور اس سے پہلے جو معانی اس کے اندر موجود تھے وہ اس میں سے نکل گئے۔ اب اس میں صرف لغوی علوم باقی رہ گئے اور تمام دوسرے علوم فنون اور صنعت و حرفت اس سے خارج ہو گئے۔

دوم یہ کہ اس کے خاص معنی سے وہ ادبی علوم (نقد و بیان) بھی نکل گئے جو دوسری صدی میں پیدا ہو کر اس میں داخل ہو گئے تھے۔ اب اس کے اندر وہی معنی رہ گئے جس کا استعمال آج ہوتا ہے یعنی فنی نثر اور شعر۔ یہی وہ معانی ہیں جن کے اندر ادب محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

سوم یہ ہے کہ اب بیشتر علماء نے ان ادبی علوم کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ مبذول کرتے ہوئے علوم ادبیہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ ابوالقاسم محمود زمخشری نے ان علوم کی تعداد بارہ بتائی ہے۔ سکاکی نے "مفتاح العلوم" میں، یاقوت نے "معجم الادباء" میں اور شریف جرجانی نے "مقدمہ شرح مفتاح" میں اور ان کے علاوہ دیگر ادباء نے بھی اس اختلاف معانی کا تذکرہ کیا ہے۔

لفظ ادب کے اس تاریخی مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ عہد جاہلیت ہی سے یہ لفظ جن دو معنی پر مشتمل تھا انھیں معنی میں آج تک استعمال ہوتا رہا البتہ ہر دور کے تقاضوں کے مطابق ان میں وسعت

اور تنگی ضرور پیدا ہوتی رہی لیکن اہم اور معروف یہی دو معنی رہے۔ یعنی ادب النفس اور ادب الدرس۔ موجودہ دور میں ادب کیلئے تخیل و جذبات کو بھی لازمی قرار دیا گیا ہے۔ یعنی کلام کا وہی حصہ ادب پارہ ہو سکتا ہے جس میں جذبات و احساسات کو جگا دینے کی صفت ہو یا احساسات و جذبات میں تغیر پیدا کر دینے کا ملکہ ہو اور وہ خوبصورت و منتخب الفاظ کے ذریعہ دلکش اور حسین پیرایہ بیان میں ادا کیا گیا ہو۔ جس کو سن کر یا پڑھ کر انسان کے اندرونی احساسات و جذبات میں ہیجان برپا ہو جائے۔ وہ فرط لذت سے جھوم جھوم اٹھے یا اندرونی کرب و الم سے دلگیر ہو جائے۔ نظم و نثر کے اسی قسم کے نمونہ کو ہم ادب عالیہ یا ادب خلاق کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم ادب کہتے ہیں تو اس سے ہماری مراد نظم و نثر سے ہی ہوتی ہے۔

مراجع و مصادر

تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ	ج اول	جرجی زیدان	دار الہلال	
تاریخ الادب العربی		احمد حسن الزیات		
القاموس الاسلامی		احمد عطیۃ اللہ	مکتبۃ النہضۃ المصریۃ ۱۳۸۳ھ	
اصول النقد الادبی		احمد الشایب	مکتبۃ النہضۃ المصریۃ ۱۹۶۳ء	
النقد الادبی		الدکتور احمد امین		
المنجد فی الاعلام		فردینال توتل	مکتبۃ شرقیۃ	بیروت لبنان
اردو دائرہ معارف اسلامیہ		دانشگاہ پنجاب لاہور ۱۹۶۴ء		
اقرب الموارد فی فصح العربیۃ والشوارد		سعید الخوری الشرتونی		
الاعلام		خیر الدین الزرکلی	مطبعہ قاہرہ ۱۹۵۴ء	

حیات نو مہم

مارچ ۱۹۶۵

حیات نو کی توسیع اشاعت اور خریداری مہم کیلئے جناب مولانا مقبول احمد فلاحی نو نومبر تا نومبر علی گڈھ میں قیام کریں گے۔ علی گڈھ کے مقامی فلاحی دوستوں اور حیات نو کے عام قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اس مہم میں تعاون کریں تاکہ اس کار خیر میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا جا سکے۔

اجلاس شوریٰ

نور محمد فلاحی
سکریٹری انجمن

۱۹ ستمبر ۱۹۸۵ء کو بعد نماز مغرب انجمن کی شوریٰ کا اجلاس شروع ہوا اور ۲۰ ستمبر کو مغرب تک جاری رہا۔ اس شوریٰ کی کچھ خاص خاص باتیں یہ ہیں۔

۱۔ حیات نو کی توسیع و اشاعت میں تمام ممبران شوریٰ اپنے اپنے حلقہ تعارف میں بھرپور کوشش کریں گے۔

۲۔ ان مستحق فارغین جامعہ کو جو اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتے ہیں انجمن حسب استطاعت وظیفہ دے گی اس کے لئے کچھ نام منتخب کرلئے گئے ہیں فی الحال یہ وظیفہ ایک سیشن کے لئے ہوگا جو دس ماہ پر مشتمل ہوگا۔

۳۔ حیات نو کی کتابت کا مسئلہ حل کرنے کے لئے ناظم جامعہ سے گفتگو کرکے شعبۂ کتابت کھولنے پر آمادہ کیا جائے گا یا کسی ایسے استاد کو لانے کی سفارش کی جائے گی جو کتابت بھی جانتا ہو تاکہ وہ تدریس کے ساتھ حیات نو کی کتابت بھی کرے۔

۴۔ حیات نو کے صفحۂ اول پر مدیر مسئول کی حیثیت سے ابوالکلام فلاحی کا نام لکھا جائے گا۔

۵۔ مقامی نظم دفعہ ۸ کے تحت طے کیا گیا کہ جن مقامات پر دو یا دو سے زائد ممبران ہوں وہاں مقامی نظم قائم کیا جائے گا جس کا ایک صدر ہوگا جن کا انتخاب مقامی ممبروں میں سے انکی کثرت رائے یا اتفاق رائے کی بنیاد پر ہوگا۔ انتخاب کے بعد صدر انجمن کی توثیق ضروری ہوگی۔

(یہ ترمیم ممبران انجمن کے مشورہ کے مطابق ہوئی ہے)

۶۔ اشتیاق دانش فلاحی کے باہر جانے کی وجہ سے شوریٰ کی جو جگہ خالی تھی وہ حافظ معین الدین فلاحی (دہلی) سے عارضی طور پر کرلی گئی ہے۔

حضرت مجزاۃ بن ثور سدوسی رضی اللہ عنہ

ابو جاوید

یہ ہیں اللہ کے بہادر اور جیالے سپاہی جو معرکۂ قادسیہ سے ظفر یاب و فتح مند ہو کر واپس لوٹے ہیں، جنگ کے گرد و غبار کو اپنے اوپر سے جھاڑتے ہوئے اللہ کی نصرت و تائید پر اظہار مسرت کر رہے ہیں، اپنے شہید ہونے والے بھائیوں کو عطا ہونے والے زبردست اجر و ثواب پر مسرور ہیں اور اگلے کسی ایسے ہی معرکہ کے لئے سراپا شوق و انتظار ہیں، جو اپنے حسن و جمال اور ہیبت و جلال میں معرکۂ قادسیہ کے مثل ہو۔ وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ جہاد کے اس سلسلے کو آگے بڑھانے کے لئے امیر المومنین کا حکم آجائے تاکہ وہ کسریٰ کی سلطنت اور ایرانی شہنشاہیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔ اور ان مہم آرا کے زندہ دل لوگوں کو زیادہ دیر تک انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔

دربار امیر المومنین حضرت فاروق اعظمؓ کا قاصد جو مدینے سے کوفہ کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے اس کے ساتھ کوفہ کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ اپنے لشکر کے ساتھ آگے بڑھ کر بصرہ سے آنے والی اسلامی فوج کے ساتھ مل جائیں اور دونوں فوجیں ساتھ ساتھ مل کر اہواز کی طرف پیش قدمی کریں ہرمزان کا تعاقب کرکے اس پر فیصلہ کن ضرب لگائیں اور "تستر" پر قبضہ کرلیں، جو تاج کسریٰ کا ایک درخشندہ ہیرا اور بلاد فارس کا تابندہ موتی ہے۔

امیر المومنین حضرت فاروق اعظمؓ کی طرف سے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام جو حکم نامہ آیا ہے اس میں اس بات کی تاکید ہے کہ وہ قبیلۂ بنو بکر کے سردار، عرب کے مشہور بہادر و شہسوار حضرت مجزاۃ بن ثور سدوسیؓ کو ضرور اپنے ساتھ لے لیں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے فوج میں خلیفہ کے اس حکم کی تشہیر کرائی، اپنی فوج کی ترتیب درست کی اور اس کے میسرہ کی کمان حضرت مجزاۃ بن ثورؓ کے سپرد کرکے آگے بڑھے اور بصرہ سے آنے والے اسلامی لشکر کے ساتھ شامل ہوگئے اور پھر دونوں فوجیں ایک ساتھ مل کر راہ خدا میں جہاد کیلئے آگے روانہ ہوگئیں۔ یہ لوگ شہروں پر قبضہ کرتے اور قلعوں کو دشمنوں کے وجود سے پاک کرتے ہوئے مسلسل آگے بڑھتے رہے اور ہرمزان

ان کے آگے بھاگتا ہوا تستر پہنچ کر قلعہ بند ہو گیا۔

تستر جس میں ہرمزان نے پناہ لی تھی —— ایران کا نہایت خوبصورت شہر تھا۔ اسکی آب و ہوا نہایت خوشگوار تھی اور اسکے حفاظتی انتظامات بہت سخت قابل اعتماد اور ناقابل تسخیر تھے۔ اسوقت وہ نہایت ترقی یافتہ اور متمدن شہر تھا جس کے تذکرے تاریخ کے صفحات میں آج تک محفوظ ہیں۔ وہ ایک ایسی سطح مرتفع پر آباد تھا جس کی شکل گھوڑے سے مشابہ تھی۔ اسکو ایک ترا دریا —— دریائے دجیل سیراب کرتا تھا۔ اس کے اوپر ایک فوارہ تھا جسے ایران قدیم کے نامور اور عظیم حکمران شہنشاہ شاپور نے بنوایا تھا۔ دریائے دجیل کا پانی زیر زمین سرنگوں سے گذار کر اس فوارے تک پہنچایا جاتا تھا۔

تستر کا فوارہ اور اسکی سرنگیں دنیا کے تعمیری عجائبات میں شمار ہوتی تھیں۔ اسے بڑے بڑے مضبوط پتھروں سے اونچا کیا گیا تھا، اس کے ستون ٹھوس لوہے کے تھے اس فوارے اور اسکی سرنگوں کو سیسہ سے پلاستر کیا گیا تھا۔

شہر تستر کے اردگرد ایک عظیم الشان اور بلند و بالا فصیل تھی جس نے پورے شہر کو اپنے احاطہ میں لے رکھا تھا۔ مورخین کہتے ہیں کہ وہ دنیا کی پہلی اور عظیم ترین فصیل ہے۔

بعد ہرمزان نے فصیل شہر کے اردگرد ایک گہری اور ناقابل عبور خندق کھدوا کر اسکے اندر ایران کی آزمودہ کار اور منتخب فوج جمع کر رکھی تھی۔ مجاہدین اسلام کے لشکر نے تستر پہنچ کر اسکے خندق کے چاروں طرف خیمہ زن ہو کر اسکا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرے کو پورے اٹھارہ مہینے گذر گئے مگر مسلمان اس مدت میں اس خندق کو عبور کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس طویل مدت میں مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان اسّی دفعہ معرکہ آرائی ہوئی۔ ہر معرکہ فریقین کے دو بہادروں کے درمیان مبارزت سے شروع ہوتا اور بعد میں گھمسان کی جنگ میں بدل جاتا۔

حضرت مجزاۃ بن ثور نے ان لڑائیوں میں ایسی غیر معمولی شجاعت و مردانگی کا مظاہرہ کیا کہ اس کو دیکھ کر دوست اور دشمن بحر حیرت و استعجاب میں ڈوب گئے۔ انھوں نے انفرادی جنگ میں دشمن کے ایک سو بہادروں کو موت کے گھاٹ آتار دیا اور دشمنوں کے دلوں میں ایسی ہیبت طاری کر دی کہ ایرانی سپاہی انکا نام سنتے ہی لرزہ براندام ہو جاتے اور انکے کارناموں پر مسلمانوں کے سر فخر سے اونچے ہو جاتے۔ انکے ان کارناموں کو دیکھ کر لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب لشکر مجاہدین میں ان کی شمولیت کے کیوں اتنا زیادہ خواہشمند تھے۔

آخری جنگ میں مسلمانوں نے ایرانیوں پر ایسا زوردار حملہ کیا کہ ایرانی اسکے مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور خندق کے اوپر بنے ہوئے پل کو مسلمانوں کے لئے خالی چھوڑ کر خود شہر کے اندر پناہ گزیں ہو گئے اور اپنے پیچھے شہر کے مضبوط قلعے کا پھاٹک بند کر لیا۔

اس صبر طویل کے بعد مسلمان اب جن حالات کا سامنا کر رہے تھے وہ پہلے سے بھی زیادہ سخت اور صبر آزما تھے۔ ایرانی مسلمانوں کے اوپر برجوں سے پیہم تیروں کی بارش کر رہے تھے اور وہ فصیلوں کے اوپر سے لوہے کی زنجیریں لٹکاتے جن کے سروں پر آنکس لگے ہوتے تھے جو آگ میں بنانے کی وجہ سے سرخ انگاروں کی طرح دہک رہے ہوتے۔ جب کوئی مسلمان فصیل کے قریب پہنچتا یا اس پر چڑھنے کی کوشش کرتا تو ایرانی اسے انھیں دہکتے ہوئے آنکسوں میں پھنسا کر اوپر کھینچ لیتے اور اسکا جسم جل جاتا، بدن کا گوشت گر جاتا اور اسطرح اسکا کام تمام ہو جاتا۔

مسلمان سخت کرب والم میں مبتلا تھے وہ نہایت خشوع و خضوع اور انتہائی گریہ زاری کے ساتھ دعا مانگ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ انکی ان پریشانیوں کو دور فرمائے اور دشمنوں کے خلاف انکی مدد کرے۔

اسی اثنا میں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ تستر کی اس عظیم الشان فصیل کو عبور کرنے کی تدابیر پر غور کر رہے تھے اور اس سے قریب قریب مایوس ہو چکے تھے کہ اچانک انکے سامنے ایک تیر آکر گرا جو ان کی طرف فصیل کے اوپر سے پھینکا گیا تھا۔ حضرت ابو موسیٰ نے اسے دیکھا۔ اس میں کاغذ کا ایک پرزہ بندھا ہوا تھا جس میں یہ پیغام تھا۔

"مسلمانو! میں تم لوگوں پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے اپنی جان، اپنے مال، اپنے اہل و عیال اور اپنے متبعین کے لئے امان طلب کرتا ہوں اسکے بدلے میں تم لوگوں کو ایک ایسے خفیہ راستے کی نشان دہی کر دوں گا جس سے گذر کر تم لوگ شہر میں داخل ہو سکتے ہو۔" جواب میں حضرت ابو موسیٰؓ نے ایک کاغذ پر امان کی تحریر لکھی اور اسے تیر کے ذریعے واپس اسکے پاس پھینک دیا۔ اس شخص کو مسلمانوں کی طرف سے دیئے ہوئے امان پر پورا اطمینان ہو گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسلمان اپنے وعدے کے کتنے سچے اور عہد کے کس قدر پکے ہوتے ہیں۔ وہ تاریکی کے پردے میں خاموشی سے ان کے پاس آیا اور حضرت ابو موسیٰؓ کو اپنی پوری حقیقت بتا دی۔

"ہم اس قوم کے سربرآوردہ لوگوں میں سے ہیں۔ ہرمزان نے میرے بڑے بھائی

کو قتل کر کے اسکے مال و جائداد پر قبضہ کر لیا ہے اور اسکے اہل و عیال پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے ہیں۔ وہ میرے لئے بھی اپنے سینے میں بغض و عداوت کے جذبات چھپائے ہوئے ہے۔ میں خود کو اور اپنے بال بچوں کو اسکی دست درازی سے محفوظ نہیں سمجھتا۔ اس لئے میں نے آپ لوگوں کے عدل و انصاف کو اسکے جور و ستم پر اور آپ لوگوں کے ایفائے عہد کو اسکی غداری پر ترجیح دی ہے۔ اور میں طے کر چکا ہوں کہ آپ لوگوں کو ایک ایسے خفیہ راستے کی نشاندہی کروں گا جس سے گذر کر آپ لوگ شہر تک پہنچ سکتے ہیں۔ آپ ایک ایسے آدمی کو میرے ساتھ کر دیجئے جو شجاعت و جرأت اور عقل و فہم سے پورے طور پر آراستہ ہو۔ اسکے ساتھ ساتھ وہ تیراکی بھی ہو تاکہ میں اسے اس راستے کی نشاندہی کر دوں۔"

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت مجزاۃ ابن ثورؓ کو طلب فرمایا اور پوری بات انکے گوش گذار کر کے فرمایا کہ "آپ اپنے قبیلے سے ایک ایسا آدمی مجھے دیجئے جو صاحب عقل و فہم ہونے کے علاوہ تیرنے کے فن میں بھی مہارت رکھتا ہو۔"

حضرت مجزاۃ نے کہا "اس کے لئے میں اپنا آپ کو پیش کرتا ہوں۔" "اگر آپ اس کیلئے تیار ہیں تو پھر ٹھیک ہے خدا آپکا حامی و ناصر ہو۔" حضرت ابو موسیٰ نے فرمایا۔ اس کے بعد حضرت ابو موسیٰ نے انکو نصیحت فرمائی کہ وہ راستے کو اچھی طرح اپنے ذہن میں مستحضر کر لیں، دروازہ کی جگہ کو خوب پہچان لیں ہرمزان کی قیام گاہ اور اس کی شخصیت کو ٹھیک سے ذہن نشین کر لیں اور اس کے علاوہ اپنی طرف سے کوئی اور اقدام نہ کریں۔

حضرت مجزاۃ بن ثورؓ اپنے ایرانی رہبر کے ساتھ تاریکی میں روانہ ہوئے۔ اور اس زیر زمین سرنگ میں داخل ہوئے جو دریا اور شہر کے درمیان بنائی گئی تھی، سرنگ کہیں کہیں اتنی کشادہ تھی کہ پانی میں کھڑے ہو کر چلنا ممکن ہوتا اور کہیں کہیں اتنی تنگ تھی کہ اس میں سے تیر کر گذرنا پڑتا کہیں شاخ در شاخ کہیں ٹیڑھی میڑھی اور کہیں بالکل سیدھی تھی۔ اس طرح چلتے ہوئے وہ اس جگہ پر پہنچ گئے جہاں سے شہر میں داخل ہونے کا راستہ نکلتا تھا۔ ایرانی رہبر نے انہیں اپنے بھائی کے قاتل ہرمزان کو دکھایا اور اس جگہ کی بھی نشاندہی کی جہاں وہ قیام پذیر تھا جب حضرت مجزاۃؓ نے ہرمزان کو دیکھا تو انکے جی میں آیا کہ اسکی حلق میں ایک تیر مار کر اسے ہلاک کر دوں مگر فوراً ہی انہیں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی

نصیحت یاد آ گئی کہ وہاں کوئی اور اقدام نہ کرنا۔ انھوں نے فوراً اپنی اس خواہش پر لگام لگائی اور طلوع فجر سے پہلے اسلامی کیمپ میں واپس آ گئے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے تین سو ایسے جانبازوں کو تیار کیا جو شجاعت و ثابت قدمی میں یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ تیراکی میں بھی ماہر تھے حضرت مجزاۃ ابن ثورؓ کو انکا قائد مقرر کیا۔ اور انہیں رخصت کرتے وقت کچھ نصیحتیں فرمائیں۔ اور شہر پر لشکر مجاہدین کے حملہ آور ہونے کیلئے ان کی تکبیر کو "شعار" قرار دیا

حضرت مجزاۃؓ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ جہاں تک ممکن ہو وہ ہلکے پھلکے کپڑے پہنیں تاکہ پانی میں بھیگنے سے انکا وزن زیادہ نہ ہو جائے۔ اور انہیں تاکید کر دی کہ اپنے ساتھ تلوار کے علاوہ دوسرا کوئی اسلحہ نہ رکھیں انہوں نے یہ بھی تاکید کی کہ سب لوگ اپنی اپنی تلواروں کو اپنے کپڑوں کے نیچے جسم کے ساتھ باندھ لیں۔ پھر ایک تہائی رات گذرنے کے بعد انہیں اپنے ساتھ لیکر روانہ ہو گئے۔

حضرت مجزاۃ بن ثورؓ اور انکے جانباز تقریباً دو گھنٹے تک اسی خطرناک سرنگ کے دشوار گذار مراحل سے نبرد آزما رہے۔ کبھی وہ ان دشواریوں پر غالب آ جاتے اور کبھی وہ انہیں زیر کر لیتیں۔

جب یہ لوگ سرنگ کے اس آخری سرے پر پہنچے جو شہر میں داخل ہونے والے راستے سے متصل تھا تو حضرت مجزاۃؓ نے دیکھا کہ سرنگ ان کے دو سو بیس جانبازوں کو نگل گئی ہے اور ان میں سے صرف اسّی آدمی بچے ہیں۔

حضرت مجزاۃؓ اور ان کے ساتھیوں نے شہر کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اپنی تلواریں بے نیام کر لیں اور قلعہ کے پہرہ داروں پر ٹوٹ پڑے اور چشم زدن میں انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر وہ لوگ دروازوں کی طرف جھپٹے اور انہیں کھولتے ہوئے زور سے تکبیر کی آواز بلند کی۔ دروازہ کے باہر سے مسلمانوں نے ان کی تکبیروں کا جواب دیا۔ اور صبح ہوتے ہوتے انہوں نے شہر پر ایک زوردار حملہ کر دیا۔ پھر ان کے اور انکے دشمنوں کے درمیان ایک ایسی ہلاکت خیز اور گھمسان کی جنگ چھڑ گئی جس کی مثال جنگوں کی تاریخ میں بہت کم گذری ہو گی۔

دوران جنگ حضرت مجزاۃؓ کی نظر ہرمزان پر پڑی۔ وہ میدان جنگ میں ایک جگہ کھڑا ہو کر اپنے فوج کی کمان کر رہا تھا۔ حضرت مجزاۃؓ اسکی طرف متوجہ ہوئے اور تلوار لیکر جھپٹ پڑے لیکن پھر لڑنے والوں کی بھیڑ میں وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ نظر آیا۔ حضرت مجزاۃؓ تیزی سے اسکی طرف لپکے اور اس پر حملہ کر دیا۔

حضرت مجزاۃؓ اور ہرمزان دونوں نے اپنی تلواروں سے ایک ساتھ ایک دوسرے پر حملہ کیا۔ مگر بدقسمتی سے حضرت مجزاۃ کا وار چوک گیا اور ہرمزان کا وار ٹھیک اپنے نشانے پر پڑا۔ حضرت مجزاۃ زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے اور دولت شہادت سے ہمکنار ہو گئے۔ ان کی شہادت کے بعد بھی مسلمانوں نے لڑائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح و نصرت سے نوازا اور ہرمزان گرفتار کر لیا گیا۔

امیرالمومنین حضرت فاروق اعظمؓ کو اس فتح کی خوشخبری سنانے کے لئے مسلمانوں کی ایک جماعت اس شان سے روانہ ہوئی کہ ان کے آگے آگے ہرمزان تھا۔ اس کے سر پر اس کا ہیروں سے مرصع تاج تھا اور اسکے کندھے پر زردوزی سے مزین اسکی خوبصورت اور بیش قیمت چادر پڑی ہوئی تھی۔ اسی کے ساتھ فتح کی بشارت سنانے والے خلیفہ کیلئے ان کے جانباز اور بہادر شہسوار حضرت مجزاۃ بن ثورؓ کی شہادت کی اندوہناک خبر بھی لئے جا رہے تھے۔

غزل

انور خاں انور
Kiddy's Garments
Bus-stand
Road
Hassan
Karnataka

جو حوادث میں پل نہیں سکتی
زندگی وہ سنبھل نہیں سکتی

زندگی موت کے شکنجے سے
کسی صورت نکل نہیں سکتی

زہر ہی زہر جس زباں پر ہو
بول میٹھے اگل نہیں سکتی

کتنی سادہ ہے دشمنی ان کی
دشمنی میں بھی ڈھل نہیں سکتی

دل ہے آخر مچل ہی جائے گا
دل کی فطرت بدل نہیں سکتی

بے ثمر ہے گیت اور ترنم سے
میری طبیعت بہل نہیں سکتی

ناامیدی کسی طرح انورؔ
میرے شعروں میں ڈھل نہیں سکتی

آپ (رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم) نہ صرف جلیل القدر اور عظیم ترین پیامبر تھے جنہوں نے روحانی تسکین کا سامان فراہم کیا بلکہ ایک ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی انقلاب کے داعی تھے۔ جس کی نظیر دنیا نے کبھی نہیں دیکھی

(چہار دیواری)

غزل

منصف مبارکپوری

یہاں دنیا میں ایک تو عمر رہتا ہے جواں کب تک
چمن سے تو مٹائے گا عنادل کے نشاں کب تک
یہاں اٹھا کریں گی ظلم کی یوں آندھیاں کب تک
یہاں فتنہ وہاں فتنہ یہاں بلوئی وہاں شورش
کبھی تیر نظر قاتل، کبھی شوخی ستم آرا
کبھی آتش، کبھی خنجر زباں کے تیر و نشتر بھی
تفنگ و تیغ و آتش جب تری شوخی کے ساماں ہیں
سراسر در ہے جور و ستم سے زندگی اپنی
یہاں ظلم و ستم کی آندھیوں کا زور ہے ہر دم
کوئی دو چار کشتے ہوں تو کہدیں داستاں انکی
ہر اک تہوار پر خوں خوشیاں اب ان کا شیوہ ہے
وطن لشکار ہے پٹتے رہیں ہم بیکس و بے بس
اٹھو کہ موت ہے دنیا میں بزدل بنکے جینا بھی
اماں کی بھیک مت مانگو لڑو جینا اگر چاہو
امیدیں صبح آزادی سے کیا کیا تھیں کہیں منصفؔ

یہاں برنائیاں تا کے یہاں رعنائیاں کب تک
اٹھے گا آشیانوں سے مسلسل یوں دھواں کب تک
یہاں ابلا کریں گے شعلے آتش فشاں کب تک
جلے گا نفرتوں کی آگ میں ہندوستاں کب تک
بھری محفل میں یوں تیری ستم آرائیاں کب تک
یہ گوناگوں جفائیں یہ ستم ایجادیاں کب تک
کریں گے رقص بسمل سامنے ہم سخت جاں کب تک
ابھی ہوتا رہے گا عاشقی کا امتحاں کب تک
ابھی چلتی رہیں گی اسطرح یہ آندھیاں کب تک
یہاں کشتوں کے پشتے ہیں سنائیں داستاں کب تک
یہ اہل دل سے یوں کرتے رہیں گے شوخیاں کب تک
بسا رہے پاؤں یوں دیکھا کریں بربادیاں کب تک
یہ دردِ بیکسی تا کے، یہ فکر نیم جاں کب تک
یہ میدان وغا ہے اسمیں یوں آہ و فغاں کب تک
اٹھیں گی عیش آزادی کی یاں پروائیاں کب تک

محمد احتشام بن حسن لکچرار اسلامک اسٹڈیز
اے ایم یو علی گڑھ

البارودی ـــــ مصر کا ایک عظیم شاعر و مفکر

محمود سامی البارودی کی شخصیت جدید عربی شاعری میں نئے اور پرانے خیالات کا سنگم مانی جاتی ہے ان کا خاندانی تعلق ممالیک کی ایک شاخ چرکسیہ برجیہ سے تھا، باپ عرب اور ماں ترکیہ تھیں۔ ۱۸۳۸ء میں قاہرہ کی سرزمین پر پیدا ہوئے اقبالمندی کے آثار چہرہ پر نمایاں تھے عمر کی ساتویں منزل میں قدم رکھتے ہی والد کی سرپرستی سے محروم ہوگئے۔ ان کی تعلیمی زندگی کی ابتدا ملٹری کالج میں داخلہ سے ہوئی جہاں انھوں نے فنون حربیہ کی تکمیل کی لیکن شعر وسخن اور علم وادب کے چسکہ نے ان کی زندگی میں ایک حسن، ایک نکھار، طبیعت میں انکساری اور بردباری پیدا کر دی انہوں نے علم و ادب کا گہرا مطالعہ کیا بیس سال کی عمر سے ہی اشعار کہنا شروع کر دیے ان کے اشعار میں ندرت خیال اور درد انگیزی اور دلسوزی کا اظہار ہوتا تھا زبان کی فصاحت ولطافت کی بنا پر جدید شعراء میں جلد ہی ممتاز درجہ حاصل کر لیا۔

انھوں نے مختلف ممالک کی سیر کی اور آستانہ میں رہ کر ترکی و فارسی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ اسی زمانہ میں خدیو اسماعیل سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے فوجی ملازمت اختیار کر لی، فرانس اور انگلستان کا سفر کیا، اسی دوران ترکی اور بلقان کی جنگ چھڑی، انھوں نے ترکی کی جانب سے جنگ میں حصہ لیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی آخرکار اوقاف کی وزارت ان کے سپرد کی گئی انھوں نے محکمہ اوقاف کی نئی تنظیم کی اور اصلاحات جاری کیں جسکی بنا پر ان کو شہرت و مقبولیت ملی، ۱۸۸۲ء میں عرابی پاشا کی تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لیا جسکی پاداش میں جلاوطن کرکے "سراندیپ" (سیلون) بھیج دیے گئے اور سترہ برس تک دیار غیر میں سرگرداں رہے اس دور ابتلا میں مشق سخن جاری رہی؛ اس دور کے اشعار میں ایک خاص تڑپ، وطن سے شیفتگی و محبت قوم کی بے بسی پر اشکباری، دلشکنی و جاں سوزی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ حسن کے شیدائی تھے، جمال یار کی جلوہ گری ان کے جذبات کو متلاطم کر دیتی اور وہ حسن شباب

کو شاعری کا عنوان بنا لیتے، اس طویل جلاوطنی نے ان کے اعصاب کو مضمحل کر دیا وہ بصارت سے محروم ہوگئے اور سماعت بھی کمزور ہوگئی ان کیفیات کی دردناک تصویر ان کے اشعار میں ملتی ہے۔

كيف لا أندب الشباب وقد أصـ — بحت كهلاً في محنة واغتراب
أخلق الشيب جدتي وكساني — خلعة منه رثة الجلباب
ولوى شعر حاجبيّ على — حتى أظل كالهدّاب
لا أرى الشيء حين يسنح إلا — كخيال كأنني في ضباب
وإذا ما دعيت حرت كأني — أسمع الصوت من وراء الحجاب
كلما رمت نهضة أقعدتني — ونية لا تقلها أعصابي
لم تدع صولة الحوادث مني — غير أشلاء همة في ثياب (۱)

میں شباب پر ماتم کیوں نہ کروں جبکہ تکالیف اور غریب الوطنی نے مجھے بوڑھا بنا دیا ہے
بڑھاپے نے شباب کے لباس کو پرانا کر دیا اور مجھے اپنی بوسیدہ قمیص پہنا دی۔
میری بھویں جھالر کی طرح آنکھوں پر جھک گئی ہیں
میں کسی چیز کو بھی نہیں دیکھ پاتا، مگر خواب وخیال کی طرح گویا کہ میں دھندا اور کہر میں گھرا ہوا ہوں
جب کوئی مجھے بلاتا ہے تو میں ہکا بکا ہو کر دیکھنے لگتا ہوں جیسے کہ میں پردے کے پیچھے کسی آواز کو سن رہا ہوں۔
جب کبھی میں نے اٹھنے کی خواہش کی کمزوری نے مجھے بٹھا دیا اور میرے اعصاب کو حرکت کرنے سے باز رکھا حوادث زمانہ کی یلغار اور سختی کی للکار سے میری ہمت کبھی کمزور نہیں ہوئی

اما پر قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے موت کے بے رحم ہاتھ نے بیٹی، بیوی، اور احباب کو چھین لیا۔ اب وہ موت وحیات کی کشمکش میں "اشلاء همة في ثياب" کے مصداق تھے موت آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی تھی ارباب حکومت نے انہیں اور ان کے جلاوطن ساتھیوں کو سنہ ۱۹۰۰ء میں مصر واپس بھیج دیا، مصر میں ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا، انھوں نے علمی وادبی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا تو ان کا گھر، "دار الادب" بن گیا، شعر وسخن کی محفلیں جمنے

---

(۱) في الأدب الحديث، عمر الدسوقي، ص ۱۵۱ الجزء الأول

گئیں، ان کے کلام کی اشاعت میں معاصر دوستوں نے بڑی مدد کی جلد ہی دیوان شائع ہو گیا اور مقبولیت وشہرت کے لحاظ سے اسکی بڑی پذیرائی ہوئی ادھر ارباب ذوق ان کے اشعار سے محظوظ ہو رہے تھے ادھر قضا و قدر کا ہاتھ ان کی طرف بڑھ رہا تھا بالآخر ۱۹۰۴ء میں دست قضا نے ان کی حیات شعلہ فشاں پر آخری مہر لگا دی اور وہ سب کچھ چھوڑ کر اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے

سامی البارودی عشق میں عالی ہمت اور مستقل مزاج تھے لہو ولعب اور فضول باتوں سے پرہیز کرتے مال دولت کی فراوانی، شباب کی مستی اور جاہ وحشمت کی برقراری کے زمانہ میں انھوں نے تعیشانہ و مسرفانہ زندگی گذاری، ان کے سینے میں محبت بھرا دل، اور حوصلہ مند عزائم تھے جس میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہ تھا بقول ان کے

أنا في الشعر عريق | لم أرثه عن كلاله
كان ابراهيم خالي | فيه مشهود المقاله

وہ محض رسمی شاعر نہ تھے بلکہ فن شاعری اور اسکے مدرکات سے اچھی طرح واقف تھے چنانچہ انھوں نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں شعر کے بارے میں نادر خیالات پیش کئے ہیں

الشعر لمعة خيالية يتألق وميضها في سماوة الفكر، فتنبعث أشعتها الى صحيفة القلب، فيفيض بلألائها نورا يتصل خيطه بأسلة اللسان، فينفث بألوان من الحكمة ينبلج بها الحالك ويهتدي بدليلها السالك، وخير الكلام ما ائتلفت ألفاظه وائتلفت معانيه، وكان قريب المأخذ، بعيد المرمى، سليما من وصمة التكلف بريئا من عشوة التعسف، غنيا عن مراجعة الفكرة،

فهذه صفة الشعر الجيد "[1]

"شعر تصور کی اس لپک کا نام ہے جو فکر کے بلند و بالا ایوان میں ضیا بار ہوتی ہے اور اپنی شعاعیں صحیفۂ قلب پر ڈال کر تنویری کرنوں کے مسلسل دھارے کا رُخ انسان کی زبان کی طرف

---

(۱) مقدمہ دیوان البارودی طبع قاہرہ

موڑ دیتی ہے اس وقت زبان حکمت و دانائی کی ایسی رنگارنگ باتیں چھیڑتی ہے جس سے سخت سے سخت تاریکیاں بھی چھٹ جائیں

بہترین کلام وہ ہے جسکے الفاظ پیوستہ اور معانی واضح ہوں، قریبی ماحول سے لیا گیا ہو لیکن انتہائی دور رس ہو تکلف کے عیب سے پاک، الجھن سے صاف اور فکری پیچیدگیوں سے آلودہ نہ ہو یہی بہترین شعر ہوتا ہے"

البارودی کی نظر میں بہترین شعر (الشعر الجید) وہ ہے جو "ما كان قريب المأخذ سليما من وصمة التكلف، بريئا من عشوة التعسف، غنيا عن مراجعة الفكرة" یہ صفات شعر غنائی کی ہیں اس قسم کے اشعار میں معانی وخیالات کی گہرائی نہیں ہوتی، وہ فکری تعقید، منطقی مسائل سے خالی اور فلسفیانہ پیچیدگیوں و موشگافیوں سے دور رہتے ہیں ایسے اشعار نفوس کو فرحت و مسرت بخشتے، اور قلوب کو حیات تازہ عطا کرتے ہیں[1] غالباً اسی لئے شعراء قدیم میں بحتری ہی کو صرف شاعر سمجھا جاتا ہے اور المتنبی اور ابو تمام کو حکیم، اسکی وجہ یہ ہے کہ بحتری کے اشعار میں معنوی تعقید اور فکری الجھاؤ نہیں اور نہ اسنے منطق وفلسفہ کے محیر العقول استدلال اور پریشان کن مسائل سے قاری کو دوچار کیا ہے۔[2]

اسی طرح البارودی کے نزدیک شعر کا مقصد (وظیفۃ الشعر) یہ ہے "تهذيب النفوس وتدريب الأفهام وتنبيه الخواطر الى مكارم الأخلاق"[3]

یعنی نفوس کو تہذیب سکھائے (اصلاح کرے) ذہنوں کی تربیت وصفائی کرے قلوب کو مکارم اخلاق سیکھنے اور انھیں اختیار کرنے کے لئے بیدار کرے"

غرضیکہ البارودی نے شعر کو سماجی اور ذہنی تربیت کا وسیلہ بتا کر اس بات کی واضح طور پر کوشش

---

(۱) كما قال عمر الدسوقي "ان الشعر غذاء القلوب وليس محارة العقول" في الادب الحديث ص ۱۵۹

(۲) كما قال البحتري يمثل نظرة العرب الى الشعر كلفتمونا حدود منطقكم والشعر يغني عن صدقه كذبه

(۳) عمر الدسوقي : في الادب الحديث ص ۱۶۰

کی ہو کہ شاعر اپنے ذہنی افق سے سماج اور ماحول پر کس طرح اثر انداز ہو سکتا ہے اس کے حیات آفریں پیغام میں قوموں کی زندگی، سرگرمیوں اور نشاۃ ثانیہ کے لئے ایک راز و الہام افکار کی بھی بشارت ہوتی ہو اور شاعر اس جوہر سے فکر انسانی کے کتنے نئے دریچے کھول سکتا ہو۔

البارودی شعر میں آورد کے قائل نہ تھے شاعری ان کے نزدیک تخیل ذہن اور ہنر کا نام نہ تھی ان کی زبان سے بے ساختہ اشعار اس طرح نکلتے جیسے کہ چشمہ ابل رہا ہو۔ ان کے اشعار میں نہ بھی سکون و اطمینان بہ نسبت قلق و اضطراب اور بے چینی کے زیادہ نمایاں ہے۔ ان کا کلام تکلف سے پاک ہے کہتے ہیں ؎

أقول بطبع لست أحتاج بعده — إلى المنهل المطروق والمنهج الوعر
إذا جاش طبعي فاض بالدر منطقي — ولا عجب فالدر ينشأ في البحر

ترجمہ میری شاعری کا دامن فطرت سے بندھا ہوا ہے مجھے نہ کسی ایسے گھاٹ کی ضرورت ہے جہاں ہر شخص سیراب ہوتا ہو اور نہ کسی تکلف آمیز سخت طریقۂ بیان کی۔ جب میری طبیعت موجزن ہوتی ہے تو زبان موتی لٹاتی ہے اور یہ کچھ عجیب بات نہیں کیونکہ موتی تو سمندر ہی میں پائے جاتے ہیں

شعر کو تکلف اور آورد سے پاک رکھنے والوں میں سے ہوتے ہوئے بھی البارودی ان شعراء میں سے تھے جو شاعری کے لئے محض زور طبیعت اور فطری صلاحیت کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ فنی تربیت و تعلیم، محنت و کاوش کو اس کا جزو لاینفک گردانتے ہیں

وہ جب کسی سے ملتے تو شعر پڑھتے ہوئے باہر آتے اور اس پر یہ ظاہر کرتے کہ شعر میں الفاظ کو مناسب اور صحیح طور سے بٹھانا شعر میں غنائیت پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔
شعر منہ سے نکالنے سے قبل اسے گنگناتا رہتا ہوں، تیر آخر تیر انداز کی طرف ہی تو منسوب کیا جاتا ہے

وأحذف به من قبل تسريحه — فالسهم منسوب إلى الرامي

البارودی نے شعر گوئی میں شعراء قدیم کے اسالیب بیان و معانی کلام کی پیروی کو مناسب و احسن سمجھا، جاہلیت کے شعراء کی اکثر و بیشتر خصوصیات ان کے کلام میں پائی جاتی

ہیں در حقیقت جدید ادب کے لئے یہ پیروی زیادہ بہتر ثابت ہوئی۔ اس لئے کہ البارودی نے اس دور میں آنکھ کھولی تھی جس میں اسلوب قدیم سے اجتناب شعراء کا ایک عام دستور بن گیا تھا مغربی لٹریچر اور شاعری کے اثر سے جدید عربی ادب و شاعر متاثر ہو رہے تھے اس دور میں البارودی نے ردیف و قافیہ کی پوری پوری پابندی کی اور فن شعر کے تمام اصول اپنی شاعری میں پیش کئے اور یورپ زدہ افراد پر ثابت کر دیا کہ نئی شراب جام کہن میں پیش کی جا رہی ہے۔ جدید خیالات کو قدیم لباس پہنایا تاکہ وضعداری بھی قائم رہے اور خیالات کی ادائیگی بھی مناسب طریقے سے ہو جائے

ان کے قصائد کا بھی یہی رنگ ہے آغاز طرز جاہلیت ہوتا ہے تو گریز میں شعر کی عہد عباسی کی شاعری کی مثال معلوم ہوتی ہے اور طرز ادا و بیان جدید دور کا مظہر ہوتا ہے مثلاً ؎

يا سعد قل لي فأنت أدرى — متى رعان العقيق تبدو

ترجمہ اے سعد تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو بتاؤ بجلی کی شعاعیں کب ظاہر ہوتی ہیں۔

یا تصنع و تکلف کے انداز میں مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں

ألا حيّ من أسماء رسم المنازل — وإن هي لم ترجع بيانا لسائل

ترجمہ سنو اسماء کے نشانات کے ٹیلوں کو مبارکباد دیتا ہوں اگرچہ کسی رات یہاں سے کسی سائل کو کوئی جواب نہیں ملا

خلاء تعفّتها الروامس والتقت — عليها أهاضيب الغيوم الحوافل

یہ وہ ویران جگہ ہے جسے ہواؤں نے بہت متاثر کیا اور پانی سے بھرے ہوئے مسلسل برسنے والے بادل اس پر امڈتے ہوئے ہیں۔

نسیب اور عورتوں کے تذکرہ میں بھی وہ بھی قدیم تشبیہات استعمال کرتے ہیں جیسے

إذا نظرت أو أقبلت أو تكلّمت — فولي مهاة الرمل والغصن والبدر

(جب وہ دیکھتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے جنگلی گائے دیکھ رہی ہو جب وہ آتی ہو تو شاخ شجر کی طرح جھومتی نظر آتی ہے اور جب وہ تبسم ریز ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بدر کامل

(رہا عو) ۳ - النسیب و وصف المرأة :-

حسب ذیل اشعار میں ان کے خیالات کی جھلک زیادہ واضح نظر آتی ہے۔

غصن بان قد اطلع الحسن فیہ   بید السحر جلنار و وردا
ما ھلال السماء؟ وما الظبی؟ وما   الورد جنیا؟ ما الغصن اوتھدی؟
ھو اجھی وجھا و اقتل الحاظا   واندی خدا ، والین قدا

ترجمہ

وہ گویا ایک شاخ ہے جسکی نزاکت (حسن) عیاں ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی طلسمی ہاتھ نے اسے گلنار بنا دیا ہے

اسکے ابروے کماندار کے سامنے ہلال کیا حیثیت رکھتا ہے۔ ہرن اسکی سی شوخی و مست نگاہی کہاں سے لا سکتی ہے اور پھول اسکی صباحت۔ اور شاخ اسکی نزاکت کا کیسے مقابلہ کر سکتی ہے: ۳ اس کا وہ رخ اسکی وہ قاتل نگاہیں، اسکے وہ شبنمی رخسار اور لچکدار قد (کیا اسکے حسن کی ضمانت نہیں ہیں)

عورت کے حسن کی مزید تعریف اس شعر میں نظر آتی ہے۔

کالورد خدا ، والبنفسج طرة   والغصن قدا ، والغزالة ملتفتا

ترجمہ :- اسکے رخسار گلاب کی طرح ہیں۔ اسکے بال بنفشہ کی طرح خوشبودار ہیں۔ اس کا قد نرم و نازک شاخ کی طرح ہو اور وہ ہرن کی طرح بار بار پلٹ کر دیکھنے والی ہے۔

> اگر نصب العین کی بلندی، وسائل کی کمی اور
> نتائج کی درخشندگی انسانی رفعت کے معیار ہیں
> تو کون ہے جو رسول عربی کے مقابل کسی دوسرے انسان کو
> پیش کر سکے (مطریٹن)

(۱) دیوان البارودی

۳ اس کی قوم کے بس میں نہیں ہے گرچہ میں آزاد ہوں کہ اسکی محبت مجھے غلام کی حیثیت سے پکا

۴ قدیم معانی کا استعمال

اپنے کلام میں اکثر جگہ انہوں نے قدیم معانی کا استعمال کیا ہے۔

مثلاً :-

لھم عمد مرفوعة و معاقل   و الویة حمر و افنیة خضر
ونار لھا فی کل شرق و مغرب   لمدرع الظلماء السنة حمر

ترجمہ :-

① ان کے پاس بلند و بالا مینار اور قلعے ہیں، سرخ علم اور ہرے بھرے میدان ہیں۔
② مشرق و مغرب میں ہر طرف آگ ہی آگ نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندھیری رات شعلہ بار زبانوں سے آراستہ و مرصع ہے

یہاں شاعر نے سرسبز و شاداب میدان کو اندھیری رات سے سرخ پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کو شعلہ بار زبانوں سے تشبیہ دے کر بہت ہی نادر خیال پیش کیا ہے۔

گھنگھور گھٹا کی آمد، برق و رعد کی چمک و گرج وغیرہ پر مسرت کا اظہار صرف عربی ماحول کی نشاندہی کرتی ہیں۔ جب کبھی برق چمکتی یا بارش ہوتی تو لوگ اپنی مسرت کا اظہار کرتے اس وقت عاشق اپنے معشوق کا ذکر کر کے اسے بھی اپنی مسرت میں شامل کر لیتا۔ اور سرور تو ایسی چیز ہے جسکا صحیح حظ انسان دوسروں کے ساتھ ہی اٹھا سکتا ہے۔ اکیلا اس سے متمتع ہو ہی نہیں سکتا لیکن یہ عجیب بات ہو کہ البارودی نے اس قسم کے اشعار اس ماحول میں کہے ہیں جو ہرگز عربی کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

البارودی نے بارش کی تعریف قاہرہ جیسے شہر میں رہ کر کی جسکے باشندوں کی خوشحالی کا دار و مدار صرف دریائے نیل پر رہتا ہے لیکن چونکہ تقلید قدما مقصود تھی اس لئے اس قسم کے اشعار البارودی کو کہنے پڑے۔

(۱) دیوان البارودی

۴۔ مدح سلطان وقت

اس صنعت سے بھی البارودی کسی جاہلی شاعر سے پیچھے نظر نہیں آتے۔ خدیو اسماعیل کی واپسی پر جو قصیدہ انہوں نے پڑھا اسکے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

رجع الخدیو لمصرہ — وأتت طلائع نصرہ
وتھللت بقدومہ — فرحاً أسرّة عصرہ
فلتبتھج أوطانہ — بحلولہ فی قصرہ
ولیشتھر تاریخہ — رجع الخدیو لمصرہ

ترجمہ:۔

خدیو مصر لوٹ آئے۔ فوج کے دستے ان کی مدد کو آتے
ان کے قدوم میمنت لزوم سے سب خوش و خرم ہیں۔
وہ جب اپنے قصر میں داخل ہوئے تو پورا ملک خوشیاں منا رہا تھا
اس قدوم کی تاریخ " رجع الخدیو لمصرہ " مشہور ہو گی۔

۵ صنائع وبدائع کا استعمال

فن بدیع کا استعمال بھی البارودی نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔
خصوصاً طباق کا ۔ مثلاً

یموت تعلی ویحیا حیرۃ وھدی — فی عالم الوجد إن صدت وإن جنحت ھوا
ونفسی حلوۃ الشمائل مرّ لہ — ھجرتی وصالا، ویقتل صدا صدا
ما علی قومہ وإن کنت حرّا — أن دعتنی لہ المحبۃ عبدا

ترجمہ: ① میرا قلب مردہ ہو جاتا ہے اور عالم وجد میں حیرانی اور سرگشتگی بسر کرتا ہے اگر وہ اعتراض کرے اور اگر وہ مائل ہو
② میری جان کی قسم جو شیریں آداب کا مالک ہے داغ مفارقت دینے میں تلخ ہے وہ زندہ کرتا ہے اور وہ جاہلیں دیتا ہے اور اعراض کرنے کی وجہ سے قتل کرتا ہے

اسی طرح البارودی اپنی تمناؤں وحسرتوں کا ذکر بھی قدماء کے رنگ میں کرتے ہیں۔ یعنی وہ رات کی آمد کا انتظار کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ رات کی تنہائی میں اپنی حسرتوں پر آنسو بہالینا اور ان کا ذکر کرنا دن کے مقابلہ میں زیادہ آسان و مناسب ہے۔ مثلاً اسی موضوع پر نابغہ کا یہ شعر

وصدرٍ أراح اللیلُ عازب ھمہ — تضاعف فیہ الحزن فی کل جانب ھا

ترجمہ:۔ اور کتنے ہی سینے ہیں جن کے غم و الم کو رات نے ٹھنڈا کر دیا جبکہ اس میں ہر جانب سے غم دوچند ہو جاتا ہے

اسی طرح نابغہ کا دوسرا شعر اسی مضمون کی تائید و توثیق کرتا ہے

فبت کأن العائدات فرشن لی — ھراسا بہ یعلی فراشی ویقشب ھا

ترجمہ:۔ میں نے اس طرح رات گزاری گویا کہ عیادت کرنے والی دوشیزاؤں نے میرے لئے کانٹے کے درخت بچھا دیئے جس سے میرا سر بلند ہو گیا اور تلوار کی طرح صیقل ہو گیا

اسی طرح محبوبہ کی نظروں کو سحر سے تشبیہ دینا ایک بہت ہی معروف اور قدیم طریقہ ہے۔ فخر کے موضوع پر ہم دیکھتے ہیں کہ البارودی (العمد المرفوعۃ) کا ذکر کرتے ہیں حالانکہ وہ قاہرہ میں بیٹھے ہوئے شاعری کر رہے تھے۔ اسی طرح آگ جلانے کی رسم جاہلیت کی ایک پرانی رسم ہے تاکہ رات میں بھولا بھٹکا مسافر آگ کو دیکھ کر ہدایت پائے اور اس کی مہمان نوازی کا شرف حاصل ہو سکے۔ مثلاً حاتم طائی کے وہ اشعار اس موضوع کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں جو اس نے اپنے غلام سے کہے۔

أوقد فان اللیل قرّ — والریح یا واقد ریح صرّ
علّ یری نارک من یمرّ — ان جلبت ضیفاً فأنت حرّ

ترجمہ:۔ آگ جلاؤ کیونکہ رات ٹھنڈی ہے، اور اے آگ جلانے والے ہوا بھی بہت تیز ہے۔

ھا دیوان النابغۃ الذبیانی
ھا۲

جلا اور خوب جلا تاکہ گزرنے والا تیری آگ کو دیکھ آجائے، اگر تو کسی مہمان کو لے آئے تو تو آزاد ہے۔

اسی طرح حکمت کے بارے میں البارودی کے حسب ذیل شعار

لعمرک ما حی وان طال سیرہ — یعد طلیقا والمنون لہ اسر

— — — — — یحل بھا سفرا ویترکھا سفر ۲

طرفۃ ابن العبد کے اس شعر سے ماخوذ ہیں — لعمرک ان الموت ما اخطا الفتی

لکا لطول المرخی وثنیاہ بالید ۳

طرفہ نے اس شعر میں انسان کو سواری سے تشبیہ دی ہے، اسکی رسی موت کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک وہ دراز رہتی تب تک انسان زندہ رہتا ہے جب رسی کھینچ لی جاتی ہے تو عمر حیات بھی تمام ہو جاتی ہے، اور دونوں کو منازل سے تشبیہ دی۔

اس قسم کی تشبیہات احادیث نبویہ اور اولیاء و صوفیاء کے اقوال میں بکثرت ملیں گی

حامد حسین نمیر

حیات نو کا اگلا شمارہ انشاء اللہ مولانا سید حامد حسین نمیر ہوگا یہ اپنی نوعیت کا غیر معمولی شمارہ ہوگا جسمیں تحریک اسلامی کے عظیم رہنما کے حالات، خدمات اور کارناموں کا تفصیلی تعارف ہوگا ——— یہ تحریک اسلامی کے کارکنوں کے لئے گائیڈ بک اور زاد راہ ہوگا۔ تقریباً سوا سو صفحات پر مشتمل قیمت صرف ۱۶ روپے پہلی فرصت میں اسے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ""

"" ادارہ ""

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

"ہفت روزہ تکبیر کے ایڈیٹر جناب محمد صلاح الدین کے حقیقت نگار اور سحر انگیز قلم سے جنھوں نے افغانستان کے محاذ کا اپنی آنکھوں سے معائنہ کیا۔ اور ایمان کو لڑتے اور یقین کو اقدام کرتے دیکھا۔"

افغانستان کے محاذ جنگ پر

پکتیا کے عظیم کمانڈر

مولانا جلال الدین حقانی

المعروف حاجی صاحب

سے ایک انٹرویو

ہم حق پر ہیں اس لئے فتح ہمارا مقدر ہے

انشاء اللہ ترکستان کے مسلمان بھی ہمارے ساتھ ہی روس کے پنجہ استبداد سے آزاد ہو جائیں گے۔

پاکستان کی سرحدوں سے ملحق افغانستان کے صوبے پکتیا کے کمانڈر اور امیر اتحاد اسلامی مجاہدین افغانستان ولایت پکتیا مولانا جلال الدین حقانی کا نام تو میں نے بہت پہلے سے سن رکھا تھا لیکن ان کا باقاعدہ تعارف گزشتہ ماہ اس وقت ہوا جب جامعہ کراچی کے سابق طالبعلم اور تکبیر کے نمائندہ خصوصی رفیق افغان ان کا انٹرویو لے کر میرے دفتر آئے۔ انہوں نے مولانا حقانی

کی تصویر پیش کی تو اس پر پہلی نظر پڑتے ہی ترکستان کے نامور مجاہد امام شامل کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوم گیا، وہی خدوخال، وہی ابھری ابھری اور سجدے کے نشان سے منور کشادہ پیشانی، وہی بڑی بڑی اور عزم و ایمان، یقین و اعتماد اور شجاعت و بصیرت کی قندیلوں سے روشن آنکھیں، وہی بھرا بھرا جسم، وہی دراز قامت، وہی گھنی، لمبی اور بھرپور داڑھی اور دشمن کا پتہ پانی کر دینے والا وہی بارعب چہرہ، وہ واقعی اسم بامسمیٰ تھے۔ دین کا پورا جلال ان کے چہرے کے گرد ہالہ کیے ہوا تھا اور دین کی حقانیت سے گہری آگہی ان کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ تاریخ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ مدمقابل بھی وہی، روسی سامراج جس سے ۱۵۰ سال قبل امام شامل نبرد آزما ہوتے رہے تھے۔ شاید ان کا قرض چکانا مولانا جلال الدین حقانی کا مقدر ٹھہرا ہے، انٹرویو پر (جو ۱۹ تا ۲۵ جولائی کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے) سرسری نظر ڈالی تو مولانا جلال الدین حقانی کی شخصیت کے باطنی اوصاف کھل کر سامنے آ گئے۔ ان کے علم کی وسعت، تاریخ کے شعور، فکر و نظر کی بلندی، جذبۂ جہاد کی فراوانی، ایمان کی قوت، تجزیہ کی صلاحیت اور اپنے موقف کی صداقت پر غیر متزلزل یقین و اعتماد نے میرے ذہن پر گہرے نقوش قائم کئے۔ مجھے افغانستان کے مجاہدین کی مختلف تنظیموں کے رہنماؤں سے ملنے اور انہیں قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن محاذ جنگ پر دادِ شجاعت دینے والے وادی پنج شیر کے عظیم مجاہد احمد شاہ مسعود اور پکتیا کے ناقابل تسخیر کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی سے ملنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ دل میں ایک عرصے سے آرزو تھی کہ مجاہدین کو اصل محاذ جنگ پر لڑتے دیکھوں۔ مولانا حقانی کے انٹرویو میں جب ایک سوال کے جواب میں یہ عبارت نظر سے گزری کہ

"جہاں تک عالم اسلام کا تعلق ہے تو وہ گزشتہ ۱۰۰ سال سے بھی زیادہ عرصے سے جہاد کی عملی صورت اور اس کی کیفیت سے ناواقف تھے۔ یہ درست ہے کہ وہ مختلف اوقات میں جنگوں کے ادوار سے گزرے اور بعض جگہوں پر علاقائی سطح پر عملی جہاد کے لیے کوششیں بھی ہوئیں لیکن بحیثیت مسلم قوم کے افغانستان کے لوگ دورِ جدید میں پہلی مرتبہ جہاد کے لفظی اور نحوی معنوں کو پورے عالم میں روشناس کرا رہے ہیں یہ کام انتہائی کسمپرسی کے عالم میں

شروع ہوا، بالکل اسی طرح جیسے اسلام کی آمد کے ابتدائی دنوں میں حالت تھی۔ یعنی اسلام بظاہر بے سروسامان اور غریب صورت میں پیدا ہوا اور پھر آہستہ آہستہ لوگوں کو ساتھ لیتا ہوا، قافلہ بناتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ ہم نے جہاد افغانستان کا بالکل اسی صورت میں آغاز کیا فقط ایمانی قوت کے سہارے ایک عظیم دنیاوی قوت سے جنگ شروع کرنا تمام لوگوں کے لئے باعث حیرت تھا۔ اس جنگ کو سات سال سے جاری رہنا اللہ کی طرف سے جہاد کے حق میں ایک اور روشن دلیل ہے۔"

تو اس روشن دلیل کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کی آرزو مزید شدت اختیار کر گئی۔ مولانا حقانی کی شخصیت میں مجھے غیر معمولی کشش محسوس ہوئی۔ رفیق افغان سے پوچھ بیٹھا "کیا اس عظیم مجاہد تک پہنچنے اور اسے مصروف جہاد دیکھنے کی کوئی صورت ممکن ہے؟" وہ اس غیر متوقع سوال پر چونک اٹھے اور حیرت سے میرا منہ تکنے لگے، پھر زیرِ لب مسکرائے اور مجھ سے پوچھا "کیا آپ سنجیدگی سے یہ سوال کر رہے ہیں؟" میرا جواب اثبات میں تھا، انہوں نے میرے اس عزم پر مسرت کا اظہار کیا لیکن ساتھ ہی راستے کی صعوبتوں اور شدید خطرات کا پورا نقشہ بھی کھینچ دیا، میری آمادگی اپنی جگہ برقرار رہی۔ انہوں نے مشورہ دیا، تنہا نہ جایئے، کسی کو ساتھ لے لیجئے۔ قرعۂ فال حیدرآباد کے ظہیر احمد کے نام نکلا وہ تفصیلات جاننے کے بعد ایک خاص منزل تک جانے پر کمربستہ ہو گئے۔ چند روز بعد ہی پشاور سے رفیق افغان کا "پیغام ملا، تشریف لے آیئے، ۱۳ جولائی کو ہم اس یادگار سفر پر روانہ ہو گئے۔

کراچی سے پشاور اور پھر یہاں سے میران شاہ اور وہاں سے افغانستان میں گردیز کے قریب واقع مجاہدین کے مرکز ژاور تک کی روداد سفر ظہیر احمد نے قلمبند کی ہے جو انہی صفحات میں قارئین کی نظر سے گزرے

نان بائی کی دکان سے سرنگ جیل تک طویل سرنگ کھودنے کا واقعہ کسی مغربی ملک میں پیش آتا تو "دی گریٹ اسکیپ" جیسی فلم تیار ہو جاتی۔

گی، شروار سے، مانشری کنڈو، نسکئی، گنجی، دوست خوست، پیرکلاں اور لنوڑی میں اوچ خاڑہ (خشک نالہ) کے مقام پر واقع مولانا جلال الدین حقانی کے مرکز اور پھر وہاں سے حاجی ابراہیم کے مرکز اسماعیل خیل مندوزئی تک کے تقریباً ۴۰ کلومیٹر کے طویل اور نہایت دشوار گزار و پرخطر پیدل سفر کی دو طرفہ روداد میرے ذمہ ہے اسے ایک مشاہداتی رپورٹ کی صورت میں علیحدہ شائع کیا جا رہا ہے، ان سطور میں ہم اپنے قارئین کو مولانا جلال الدین حقانی کی شخصیت، ان کی مجاہدانہ زندگی اور ان کے خیالات سے متعارف کرانا چاہیں گے۔

مولانا حقانی، جنہیں احتراماً حاجی صاحب کے نام سے پکارا جاتا ہے، قبیلہ زدران سے تعلق رکھتے ہیں اور پکتیا کی وادی شمل کے رہنے والے ہیں، ان کے گاؤں کا نام سران ہے۔ ان کے والد خواجہ محمد خان تاجر تھے اور پاکستان اور افغانستان کے درمیان تجارت کیا کرتے تھے۔ ان کے تین چھوٹے بھائی ہیں۔ حاجی ابراہیم : (کمانڈر اسماعیل خیل) اور محمد اسماعیل (کمانڈر سران مرکز) اور محمد خلیل جو اس وقت میران شاہ میں والدہ کے پاس ہیں اور عملی جہاد میں شرکت کے علاوہ رابطہ اور رسد وغیرہ کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔

حاجی صاحب کی عمر ۴۰ سال ہے اور وہ شادی شدہ ہیں، بیوی اور ایک بیٹا والدہ کے پاس ہیں۔ میران شاہ میں ان کی والدہ نے بتایا کہ جلال الدین کو بچپن ہی سے قرآن حکیم سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ وہ اللہ کی کتاب کو کبھی سر پر رکھتے، کبھی داہنے بائیں کاندھے پر لٹکاتے اور کبھی سینے سے لگاتے حصول علم کا شوق جنوں کی حد تک تھا۔ ابتدائی تعلیم مقامی مدرسے میں حاصل کی۔ پھر اکوڑہ خٹک بھیجے گئے جہاں درس نظامیہ سے فراغت کے بعد دو سال مدرس بھی رہے۔

واپس آ کر حج کے لیے گئے اور پھر شمل میں ایک مدرسہ کھولا، شاندار مسجد تعمیر کی، یہاں دو سو طالب علم زیر تعلیم تھے، ۱۴ سال قبل ان کی شادی ہوئی۔ والدہ نے بچپن کا ایک واقعہ سنایا جس نے ان کے خیال میں جلال الدین کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالا وہ بہت چھوٹے تھے، گاؤں میں ایک درویش آیا جو بیمار تھا۔ شدید سردی کا زمانہ تھا وہ ایک نالے میں گر گیا، جلال الدین نے اسے نالے سے نکالا، گھر لا کر کپڑے تبدیل کرائے دوا دی اور کھانا کھلایا۔ یہ درویش ان کا گرویدہ

ہو گیا، اس نے جلال الدین کے والد کو ہدایت کی کہ اس بچے کو آزاد چھوڑ دے رکھنا، اس پر پابندیاں نہ لگانا اور نہ کبھی مارنا پیٹنا، یہ بہت بڑا مجاہد اور عالم دین بنے گا۔ یہ شروع سے بہت حساس اور سنجیدہ مزاج تھے۔ والد نے ایک بار مارا تو مسلسل تین روز روتے رہے اور کھانا پینا چھوڑ دیا۔

حاجی صاحب نے جہاد کا آغاز ۱۴ سال قبل ظاہر شاہ کے دور ہی میں کر دیا تھا اس وقت داؤد وزیر اعظم تھا، روس سے راہ و رسم بڑھی، کچھ افغان طلبہ تربیت کے لیے روس بھیجے گئے اور کچھ روسی، وفود کی صورت میں افغانستان آئے تو علماء نے افغانستان کے دروازے روس پر کھولنے کے نتائج سے حکومت کو متنبہ کیا جو بات اعلیٰ تعلیم یافتہ ظاہر شاہ، داؤد اور دوسرے "روشن دماغ" حکمرانوں کی "دور اندیش نگاہیں" نہ دیکھ سکیں، اسے مدارس کے "رجعت پسند" اور "دقیانوسی" مولویوں نے افغان سرزمین پر روسیوں کا پہلا قدم پڑتے ہی بھانپ لیا احتجاج کی آواز بلند ہوئی تو حسب روایت ترقی کا راستہ روکنے والے علماء کو کچل دینے کے لیے طاقت کا استعمال شروع ہوا، خلقی اور پرچمی ان کے خلاف پروپیگنڈے کا محاذ کھول کر میدان میں آ گئے، ظاہر شاہ اور داؤد نے بھی نہ صرف انہیں کھلی چھٹی دی بلکہ پوری سرکاری مشینری علماء کی گرفتاری و نظر بندی پر لگا دی۔ ظاہر شاہ کے اپنے دور میں، سو علماء اور حفاظ شہید ہو گئے۔ قندھار میں موئے مبارک اور جبہ شریف موجود تھے۔ جن کی زیارت کی جاتی اور بہت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا وہاں کے گورنر نے ان تبرکات کی توہین کی اور ساتھ ہی نبی اکرمؐ کی شان میں گستاخی بھی کی۔ علماء نے کفر کا فتویٰ دیا۔ شہر میں زبردست مظاہرے ہوئے۔ جلوس نکالے گئے جن کی قیادت حاجی جلال الدین نے کی، گورنر کو لوگوں نے پکڑ لیا، داؤد نے حاجی صاحب کے نام خصوصی خط لکھ کر اور مناسب کارروائی کی یقین دہانی کرا کے بمشکل اس کی جان چھڑائی لیکن بعد میں اسے رہا کر دیا۔ خوست میں خلقی اور پرچمی ملحدوں نے مساجد کو نذر آتش کر دیا۔ یہاں زبردست لڑائی ہوئی اور بہت سے لوگ شہید ہوئے۔ افغانستان میں ظاہر شاہ کے دور ہی میں جن لوگوں

نے سب سے پہلے اعلان جہاد کیا اور گوریلا جنگ کا فیصلہ کیا ان میں مولوی حبیب الرحمٰن ڈاکٹر محمد عمر، انجینئر حبیب الرحمٰن، عبدالرحیم نیازی استاد منصور اور انجینئر گلبدین حکمت یار شامل تھے۔ اور مولوی جلال الدین ان کے سرگرم ساتھیوں میں شامل تھے۔ یہ سب حزب اسلامی کے رہنما تھے۔ اس دوران دو اہم واقعات پیش آئے، ایک فتویٰ دینے والے علماء کی گرفتاری اور دوسرے خلق پارٹی کے لیڈر، کابل کے امیر اور وزیر منصوبہ بندی میر اکبر کا قتل، اسے مولوی جلال الدین کے ایک آدمی مجاہد نے ہلاک کیا، وزیر جوں ہی گھر سے نکلا، مجاہد نے اس پر پستول سے گولیاں چلائیں اور پھر پستول ایک طرف پھینک کر وہ بھاگا اور ایک حمام میں جا گھسا، وہاں اپنی داڑھی مونڈی، حلیہ تبدیل کیا اور فرار ہو کر پاکستان آگیا، بعد میں پھر جہاد میں شرکت کے لیے واپس آیا اور ایک لڑائی میں شہید ہو گیا۔ اس واقعے کے بعد شمل میں حاجی صاحب کے گھر کا پولیس نے محاصرہ کیا اور انہیں گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی، اس کارروائی کی قیادت خود کمشنر نے کی لیکن مقابلہ ہوا تو کمشنر شدید زخمی ہو کر گر پڑا، ۴۰ سپاہی مارے گئے اور متعدد زخمی ہوئے حکومت نے فوج بھیجی،

اس وقت حاجی صاحب اور ان کے تینوں بھائی گھر میں موجود تھے۔ فوجی کمانڈر نے داؤد کا خط حاجی صاحب کو بھیجا جس میں صرف ایک دن کے لیے انہیں کابل آنے کی ہدایت

مجاہدین نے خوست کے ہوائی اڈے کا محاصرہ کر لیا

پاکستان ٹیلی وژن نے اپنی ۱۹ اگست کی ۹ بجے شب کی خبروں میں بتایا ہے کہ مجاہدین نے پکتیا کے شہر خوست میں ہوائی اڈے کا محاصرہ کر لیا ہے واضح رہے کہ مجاہدین شہر کا مکمل محاصرہ پہلے ہی سے کئے ہوئے ہیں اور انہوں نے ہوائی اڈ کو اسماعیل خیل کی چوکی سے اپنی زد میں لیا ہوا تھا۔

کی گئی تھی۔ کمانڈر نے بتایا کہ ہمیں حکم ملا ہے کہ آپ کو عزت و احترام سے اپنے ساتھ لے چلیں، آپ نے انکار کیا تو گھر اور پوری بستی تباہ کر دی جائے گی۔ حاجی صاحب نے کہا کہ میں تیار ہوں، کل آ جاؤ، ساتھ چلوں گا۔ لیکن فوجی افسر نہیں مانا۔ حاجی صاحب پستول لے کر باہر نکلنا چاہتے

تھے کہ چھوٹے بھائی حاجی ابراہیم نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور پستول چھین لیا، انہوں نے کہا کہ اس وقت نرمی اور حکمت سے کام لو، ہم پیچھے کھڑے ہیں۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو مقابلہ کریں گے، اسی دوران ایک فوجی نے، جو حاجی صاحب سے ہمدردی رکھتا تھا، آنکھوں کے اشارے سے بتایا کہ فوجی افسر کا ارادہ اچھا نہیں، اپنے تحفظ کی صورت نکالو۔ فوجی افسر نے دھمکی دی کہ تم زور ان ہو اور میں حاجی تمہیں زندہ یا مردہ ساتھ لے گیا تو میں حاجی

خوست میں افغان فوجیوں نے بغاوت کر دی، اسلحہ سمیت مجاہدین سے آملے، روسیوں نے بدحواسی میں زبردست بمباری کی ۲۰ اگست کا واقعہ

جمعہ ۲۰ اگست کو ہم ژوار میں تھے کہ خوست میں ایک اہم واقعہ پیش آیا، ہمیں وائرلیس کے ذریعے ملنے والوں پیغام کے حوالے سے بتایا گیا کہ روسی طیاروں نے لغوڑی اور اس کے اطراف کی چوکیوں پر زبردست بمباری کی ہے، یہ طیارے دس دس کی ٹکڑیوں میں آتے اور کئی چکر لگا کر انہوں نے بموں کی بارش کی لیکن اس حملے میں مجاہدین کا کوئی نقصان نہیں ہوا، ان طیاروں کی پرواز اور ان کے برسائے ہوئے بموں کے دھماکوں کی آواز ہمارے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔ ہم ۲۳ اگست کو لغوڑی میں واقع "روح کھارڈہ" کے مرکز میں پہنچے اور مولانا جلال الدین حقانی سے اس واقعہ کی تفصیل پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ خوست ایئرپورٹ کے قریب فارم باغ میں روسیوں نے ایک چوکی قائم کر رکھی ہے۔ وہاں کرنل فوج کے ۱۲۱ سپاہیوں اور پانچ افسروں نے اپنے کمانڈر حیات اللہ کی قیادت میں بغاوت کر دی اور اپنے اسلحہ سمیت مجاہدین سے آملے۔ وہ ۲۲۵ کلاشنکوف، ایک وائرلیس سیٹ، ایک واشکا، گرنیوف اور ایمونیشن کی بھاری مقدار اپنے ساتھ لائے۔ مجاہدین نے ان کی آمد پر فلک شگاف نعرے لگائے۔ اس بغاوت نے خوست میں ہلچل مچا دی، روسیوں کو سخت دھچکا لگا۔ اور وہ بقیہ افغان فوجیوں کی وفاداری کے بارے میں بھی سخت تشویش میں مبتلا ہو گئے

انہوں نے ہر حواسی میں طیاروں سے بمباری کی مگر اپنا اسلحہ ضائع کرنے کے سوا کچھ حاصل نہ کر سکے۔ افغان فوجیوں کو تین دن قبل ہی طیاروں کے ذریعہ خوست لایا گیا تھا ۲۵۰ سپاہی تین پروازوں سے یہاں پہنچائے گئے۔ ان میں ۱۱۰ غزنی سے اور باقی گردیز سے لائے گئے تھے۔ اس واقعہ کا خوست کی روسی چھاؤنی پر بہت منفی اثر پڑا ہے۔ ہمیں اپنے پیامبروں کے ذریعے ان کی پریشانی کا تفصیلی حال معلوم ہوا ہے۔

نہیں، ادھر علاقے کے معززین جمع ہوئے اور انہوں نے حاجی صاحب سے کہا کہ تم چلے جاؤ ورنہ ہم سب مارے جائیں گے، اسی سپاہی نے جو آنکھ کا اشارہ کر کے صورت حال سمجھا چکا تھا آگے بڑھ کر فوجی افسر سے کہا کہ آپ لوگ چلے جائیں، انہیں میں ساتھ لے کر آتا ہوں یہ کہہ کر وہ مکان کے اندر گھس گیا اور جاتے ہی حاجی صاحب اور ان کے بھائیوں کو مشورہ دیا کہ برقعہ میں باہر نکل جاؤ ورنہ سب مارے جاؤ گے، وہ حاجی ابراہیم کو ساتھ لے کر باہر آیا۔ انہوں نے فوجی افسر سے کہا کہ ہمارے گھر آئی ہوئی کچھ خواتین باہر جائیں گی آپ ایک طرف ہو جائیں۔ ہم حاجی صاحب کو چلنے کیلئے تیار کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد دو عورتیں مکان سے نکلیں اور گلیوں میں جا کر غائب ہو گئیں، ان میں ایک حاجی صاحب تھے اور دوسرے خادم حسین، پھر حاجی ابراہیم بھی اسی طرح نکل آئے، جس فوجی نے یہ ترکیب بتائی اس کا نام امان اللہ تھا اور وہ آج بھی حاجی صاحب کے مجاہدین میں شامل ہے، یہ لوگ صبح ۱۱ بجے نکلے اور ۲ بجے پہاڑ پر جا پہنچے۔ فوجی افسر پر یہ راز کھلا تو وہ غصے سے دیوانہ ہو گیا، مزید فوج طلب کی گئی اور حاجی صاحب کا گھر بلڈوز کر دیا گیا، ادھر پہاڑ پر حاجی صاحب نے مورچہ بندی کی اور مجاہدین کا مرکز بنایا حکومت نے دوسرے قبائل کو ساتھ ملا کر حملہ کیا لیکن انچارج فوجی افسر زخمی ہوا اور باقی لوگ بھاگ گئے۔ یہاں خوراک کی رسد بند ہوئی تو حاجی صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ایک ماہ تک جنگل کے درختوں کے پتے اور بوٹے کھا کر گزارہ کیا۔ ان کے ساتھیوں نے یہاں سے نکلنے کی ترکیب بتائی۔ ان کے مشورہ پر رات کو آگ روشن کی گئی تاکہ دشمن کو یہ یقین ہو جائے کہ حاجی صاحب اور

ان کے ساتھی یہاں مقیم ہیں، اسی دوران وہ دوسرے راستے سے اپنے گاؤں کے قریب ایک اور گاؤں میں آ گئے اور پھر شدید بارش میں دو دن تک پیدل چل کر پاکستانی علاقے میں داخل ہو گئے۔ یہ واقعہ ظاہر شاہ کی رخصت کے بعد داؤد کے دور حکومت میں پیش آیا، حاجی صاحب تین مرتبہ گرفتار بھی ہوئے لیکن

حاجی جلال الدین حقّانی اور ان کے ساتھیوں نے ایک ماہ تک درختوں کے پتے اور بوٹے کھا کر گزارہ کیا۔

عدم ثبوت کی بنا پر انہیں ہر بار رہا کر دیا گیا۔

داؤد کے دور کا اہم ترین واقعہ جو ۱۹۷۷ء میں پیش آیا، حزب اسلامی کے رہنماؤں کی گرفتاری، مرنگ جیل میں سرنگ کھود کر ان کو نکالنے کی کوشش اور پھر پل چرخی جیل میں پھانسی کی صورت حال میں، ان کی شہادت تھا۔ بغاوت اور حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کے الزام میں مولوی حبیب الرحمٰن، انجینئر حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر عمر، عبدالرحیم نیازی اور استاد منصور کو گرفتار کر کے مرنگ جیل میں قید کر دیا گیا، صرف انجینئر گلبدین حکمت یار ہاتھ نہ آ سکے، وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور پاکستان آ گئے۔ مرنگ جیل کے سامنے ایک کشادہ سڑک ہے، اس کے دوسرے سرے پر چھوٹا سا بازار ہے جہاں [illegible] تھے میں ایک نانبائی کی دوکان بھی تھی۔ اس دوکان سے جیل کی کوٹھڑی تک ایک سرنگ کھودنے کی منصوبہ بندی کی گئی۔ جیل میں گرفتار شدگان کو پیغام دیا گیا کہ آپ ادھر سے سرنگ کھودیں اور ہم ادھر سے، دونوں میں آ کر ایک مقررہ جگہ پر ہم آپس میں مل جائیں گے۔ یہ کام انتہائی رازداری، مہارت اور متعین خطوط کے مطابق انجام دیا گیا دوسری جانب سے سرنگ کھودنے والے اتنے قریب آ گئے کہ درمیان کی دیوار پردہ کی طرح ہلنے لگی، اگلے روز اسے گرا دینے کا منصوبہ تھا کہ رات کو اچانک ایک حادثہ پیش آ گیا۔ جیل کے اندر پانی لانے والا ایک ٹینکر اپنی مقررہ گزرگاہ سے داخل ہوا تو ایک جگہ اگلے پہیے زمین پر دھنس گئے، اس طرح ٹینکر کو نکالنے کی کوشش کی گئی تو وہاں سرنگ کا انکشاف ہوا، ہر طرف

جھگڑپ مچ گئی۔ جیل کے اطراف سپاہی پھیل گئے۔ فوج بھی طلب کرلی گئی، بازار میں ایک ایک دوکان کی چھان بین کی گئی اور بالآخر سرنگ کا سرا ہاتھ آگیا، نانبائی کی دوکان سے متصل تین کمروں میں مٹی کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور ادھر گرفتار شدگان کی کوٹھری میں بھی چٹائیوں کے نیچے مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی، قیدیوں کو فوراً ہی چرخی جیل منتقل کیا گیا جہاں انہیں پھانسی دے دی گئی۔ نانبائی ہاتھ نہ آسکا۔ اس کا نام مجاہد تھا اور یہ وہی مجاہد تھا جس نے امیر کابل اور وزیر منصوبہ بندی میر اکبر کو قتل کیا تھا۔ یہ مولانا جلال الدین حقانی کا آدمی تھا اور اس کے ساتھ جن لوگوں نے سرنگ کھودنے میں حصہ لیا ان میں دو بھائی حجۃ اللہ اور احمد اللہ اور یوسف شامل تھے۔ جرأت و عزیمت کا یہ واقعہ کسی مغربی ملک میں پیش آتا تو وہاں دی گریٹ اسکیپ جیسی فلم تیار ہوجاتی لیکن کابل کے اس اہم واقعہ کی دنیا کو پوری طرح خبر بھی نہ ہوسکی۔

روس نواز حکومت کا تختہ الٹنے کی اب تک تین بار منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ ان میں سے دو بار حاجی صاحب شریک تھے۔ ان کا شمار شہادت پانے والے اولین رہنماؤں اور ان کے ساتھی گلبدین حکمت یار کے بعد دوسری صف میں ہوتا ہے۔ لیکن اپنی طویل اور مسلسل جدوجہد اور روسی فوجوں کی آمد کے بعد انجام دیئے گئے عظیم کارناموں کی بدولت وہ مجاہدین کے صف اوّل کے کمانڈر شمار ہونے لگے ہیں۔ احمد شاہ مسعود کا نام آج کل دنیا بھر میں گونج رہا ہے اور وہ بجا طور پر اس کے مستحق بھی ہیں لیکن وہ عملی جہاد کے معاملہ میں حاجی صاحب سے جونیئر ہیں۔ ان کی شہرت میں انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر ان کے عبور اور بیرونی صحافیوں سے رابطہ کو بھی بڑا دخل حاصل ہے جبکہ حاجی صاحب صرف پشتو، فارسی اور عربی زبان پر قدرت رکھتے ہیں اور بیرونی صحافیوں کی دسترس سے بہت دور ہیں البتہ بیرونی صحافی اس امر کا اعتراف ضرور کرتے ہیں کہ روسیوں کے لیے دہشت بننے والے نام صرف دو ہی ہیں، وادیٔ پنج شیر کے نوجوان کمانڈر احمد شاہ مسعود اور پکتیا کے حاجی جلال الدین حقانی۔

باقی

عبیداللہ فہد فلاحی

بزم سلیمانؒ تاج المساجد بھوپال ـــــ ایک تاثراتی مکتوب

۹ر۹ر۸۵ء

بھائی طارق ـــــ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں۔

ابھی کل ہی بزم سلیمان بھوپال میں شرکت سے فارغ ہوکر علی گڑھ واپس پہونچا ہوں۔ چونکہ یہ کل ہند سمینار اپنی نوعیت کا منفرد تھا اس لئے چاہتا ہوں کہ قارئین حیات نو بھی تھوڑی دیر کیلئے اس سمینار کی سیر کرلیں۔ ۴ تا ۷ ستمبر کو یہ سمینار سید سلیمان ندویؒ کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے بھوپال کے تاریخی شہر میں تاج المساجد میں مولانا محمد عمران خاں ندوی کے زیر اہتمام منعقد ہوا جس میں ملک کی نامور علمی شخصیات شریک ہوئیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سید صباح الدین عبدالرحمٰن، سید ہاشم علی وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پروفیسر خلیق احمد نظامی اس سمینار کی مقتدر علمی شخصیات تھیں۔ سفیر مصر جناب عمرو موسیٰ کے اعزاز میں پہلے دن استقبالیہ دیا گیا۔ جس میں دارالعلوم تاج المساجد کی انجمن الطلبہ کے سکریٹری نے سپاس نامہ پیش کیا۔ سمینار میں کل ساٹھ مقالے پیش کئے گئے جن میں صرف تیس پڑھے جاسکے ندوۃ العلماء سے مولانا علی میاں کے علاوہ مولانا ابوالعرفان ندوی، مولانا محمد رابع حسنی ندوی، مولانا نور عالم ندوی وغیرہ حضرات شریک تھے دارالمصنفین سے مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا ابوالبقاء ندوی مولانا عبیداللہ کوٹی ندوی وغیرہ۔ جامعہ ملیہ سے پروفیسر مشیر الحق، ڈاکٹر شفیق احمد ندوی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی، دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی علی گڑھ سے ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی، پروفیسر اقبال احمد انصاری، ڈاکٹر محمد راشد ندوی، ڈاکٹر عبدالباری، ڈاکٹر اقبال انصاری (شعبہ انگریزی)، ڈاکٹر مسعود الرحمٰن ندوی، محمد صلاح الدین عمری (ریسرچ اسکالر شعبہ عربی) اور خاکسار راقم شامل تھا۔ تقریباً سارے مقالات

محنت سے لکھے گئے تھے خاص طور سے ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی کا مقالہ سید سلیمان ندوی کی تنقیدی بصیرت، مولانا ابوالعرفان ندوی کا مقالہ ملفوظات سید سلیمان ندوی، شفیق احمد ندوی کا مقالہ عربی ثقافت کے فروغ میں سید صاحب کا کردار "ضیاء الدین اصلاحی کا" "سیرت النبی کے بعض قرآنی مباحث" "عبید اللہ کوٹی ندوی کا مقالہ" "سید سلیمان ندوی اور فقہ اسلامی" بطور خاص پسند کیے گئے ڈاکٹر اقبال احمد انصاری (شعبہ انگریزی علی گڑھ) اور مولانا حبیب ریحان ندوی کے مقالات اس لحاظ سے منفرد و ممتاز تھے کہ ان میں سید صاحب کے کاموں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا تھا اور کسی حد تک بات کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ پروفیسر مشیر الحق صاحب اور پروفیسر خلیق احمد نظامی اور سید صباح الدین عبد الرحمٰن کے مقالات ادب کا شاہکار اور فکر و فن کے مرغزار تھے۔ طلبہ میں سے عبید اللہ فہد کا مقالہ سید صاحب کی قرآنی تحقیقات، اور محمد صلاح الدین عمری کا مقالہ سید صاحب کا تصور خلافت شامل تھے۔ صلاح الدین صاحب نے اپنے مقالے میں یہ ثابت کر دیا کہ سید صاحب نظام اسلامی، اسلامی انقلاب اور حکومت الٰہیہ کے قیام کے داعی اور نقیب اولین تھے۔ اور آج دنیا میں خاص طور پر ہندوستان میں اسلامی انقلاب کی آمد کی جو صدا سنائی دے رہی ہے اس کا بہت کچھ سہرا سید صاحب کے سر بھی بندھتا ہے۔ مولانا حبیب ریحان ندوی کے مقالہ میں بھی تحریکی اثرات موجود تھے اور راقم الحروف کے مقالہ پر بعض حضرات نے دستر خوان پر "جماعت اسلامیت" کا لیبل لگا دیا جو کم از کم میرے لئے باعث فخر تھا۔

پہلے دن کی شام کو ایک شعری نشست ہوئی جس میں شعراء کرام نے سید سلیمان ندوی کو اپنا نذرانہ عقیدت پیش کیا کہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کو یہ خدشہ محسوس ہونے لگا کہ مبادا شعراء مقالہ نگاروں پر سبقت لیجائیں لیکن بعد میں مقالہ نگاروں نے ان کا یہ خدشہ دور کر دیا۔

تین دن کے اس پروگرام میں عوام کی مسلسل شرکت اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ بھوپال کے مسلم عوام کس قدر دین اسلام سے لگاؤ اور محبت رکھتے ہیں۔ متعدد حضرات اور اداروں نے مندوبین کو پر تکلف عصرانہ، ظہرانہ اور عشائیہ دیا۔ مولانا علی میاں اور سید ہاشم

علی صاحب کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ جامعۃ الفلاح اور تحریک اسلامی کی نمائندگی کی کمی شدت سے محسوس ہوئی ان سیمیناروں میں گرچہ زیادہ تر بحث و مباحثہ اور سوال و جواب سے زیادہ آگے بات نہیں بڑھتی لیکن اگر ان میں شرکت کی جائے تو علمی سطح پر اپنی بات پیش کرنے اور ہم خیال اور موافق علماء و دانشوروں کا حلقہ بنانے میں سہولت رہتی ہے۔

بھوپال کے دوران قیام میں مولانا عبید اللہ کوٹی ندوی کا بے تکلفانہ انداز، مولانا حبیب ریحان ندوی کی برجستہ فقرے بازی اور بے ساختہ علمیت، مولانا عبد النور ندوی کی خاموش محبت اور محمد صلاح الدین عمری کی رفاقت نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا۔ جناب یوسف ندوی جو اب انشاء اللہ علی گڑھ کے طالب علم ہونے والے ہیں، جس طرح ہم لوگوں کی خدمت کی اس کا اجر اللہ تعالیٰ ہی دے گا۔ حافظ محفوظ خاں فلاحی وقتاً فوقتاً مزاج پرسی کرتے رہے۔ جناب ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خان ندوی کی ڈانٹ اور پھٹکار سے بھی لطف اندوز ہوئے۔ برادر بزرگ استاذ کریم جناب یٰسین مظہر صدیقی کی شخصیت ہمیشہ باغ و بہار رہی انھیں کے تعاون، مشورہ بلکہ اصرار سے میں سیمینار میں شرکت کے قابل ہو سکا۔ ایک روز صبح کے وقت چائے پی کر ہم لوگ تاج المساجد واپس آ رہے تھے کہ یٰسین صاحب اور محسن عثمانی صاحب راستہ میں مل گئے انھوں نے زبردستی دوبارہ چائے پینے پر مجبور کر دیا اور برجستہ محسن صاحب نے یہ شعر سنا دیا۔

ہزار بار مجھے لے گیا ہے ہوٹل میں ٭ وہ ایک کیف جو ہر قطرۂ سبو میں ہے

اس سیمینار کی کامیابی کا سہرا دراصل مولانا عمران خان ندوی کے حسن انتظام اور ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خان ندوی کے سیمابی حرکیت کے سر بندھتا ہے۔

بھوپال شہر کی رونق اور آبادی کو دیکھ کر یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ ابھی پچھلے دنوں یہاں سے قیامت صغریٰ گزر چکی ہے۔ بیس بائیس ہزار انسانوں کی کمی کہیں محسوس نہ ہوئی شاید یہ فطرت کا اصول ہے اگر اسی طرح حادثات و آفات کو لوگ نہ بھول جایا کریں تو زندگی مصیبت بن جائے۔

والسلام

آئینہ احساس

قاضی تاج الدین تاج اورنگ آبادی تم ہالکی راجہ رائے تعلقہ خلد آباد ضلع اورنگ آباد کی پانچ کتابیں ہمارے سامنے میز پر مہینوں سے رکھی ہوئی ہیں کئی بار انھیں اٹھایا اور پڑھنے کی کوشش کی مگر کسی نہ کسی وجہ سے ناتمام رکھنا پڑا آج پھر ہم نے ہاتھ بڑھایا تاکہ کچھ پڑھ سکوں لیجیے آپ بھی ہمارے اس مطالعہ میں شریک ہو جائیے

"آئینہ احساس" چھوٹا سائز ۸۰ صفحات " قیمت ۵ روپیہ، عمدہ ٹائیٹل، کتابت و طباعت گوارا۔

یہ کتاب قاضی صاحب کے قلبی واردات اور احساسات کا مجموعہ ہے جس کو بڑے خوبصورت انداز میں اشعار کی شکل میں صفحۂ قرطاس پر رقم کر دیا گیا ہے "نقش صداقت" کے عنوان سے واردات قلب کو یوں رقم کرتے ہیں۔

کس طرح عام امن کی تحریک ہو بحال
بر حق کوئی نظام سیاست نہیں ہے آج
حق کے سوا نہ ہو کوئی بہتر نظر اصول
فنکار کی زباں میں صداقت نہیں ہے آج

وہ "شکست آرزو" کے عنوان سے ایک دوسری جگہ رقم طراز ہیں۔

شکست آشیاں کا رنج تا اثر بھول جاتا ہے
خزاں میں جب بہاروں کی خبر معلوم ہوتی ہو
بدلتا ہے نظام خود پرستی تاج عالم کا
یہ جرأت صدق پرور خوب تر معلوم ہوتی ہے

"آرزوئے حیات" کے عنوان سے ملاحظہ ہو۔

زبان صدق سے اب دل کو رام کرنا ہے
نازِ عشق میں غم کو امام کرنا ہے
چمن میں مثل نسیم سحر ادب سے چلیں
نگاہ حسن میں پیدا مقام کرنا ہے

وہ "فکر خموش" کے تحت لکھا ہے۔

بے اثر فریاد بھی جب ہو گئی
دل کی دھڑکن بن گئی ہے خامشی
تاج ضبط غم کی یہ تاثیر ہے
دیدۂ تر بن گئی ہے خامشی

کتاب کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں

ذکر خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم صفحات ۹۶ ۔ کتابت و طباعت لائق مطالعہ قیمت دس روپے ۔

مصنف۔ قاضی تاج الدین تاج ۔

ملنے کا پتہ ادارہ علم و عرفاں اے ۔ ۶ ۔ ۲۵ ۔ آصفیہ کالونی اورنگ آباد ۔ یہ نعت رسول کا مجموعہ ہے ۔ انداز بیان سادہ اور سہل ہے حضور اکرم صلی اللہ کی سیرت و کردار واقعات و حالات کو نعت کی شکل میں ڈھال دیا گیا ہے حقیقت پسندی کا کام لیا گیا غلو اور انتہا پسندی سے یہ کتاب بہت حد تک محفوظ ہے ۔ کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے زیادہ مفید ہے ۔

ان دونوں کتابوں کے علاوہ تین اور کتابیں ۔ تجلیات سخن صفحات ۴۶ / قیمت دو روپے ۔ ۲ ۔ چراغ علم و دانش ۔ صفحات ۲۲ ۔ قیمت ۳ روپے ۔ گلشن بے خزاں ۔ صفحات ۱۸ / قیمت دو روپے ۔ ملنے کا پتہ ادارہ علم و عرفاں

یہ تینوں کتابیں ۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں قرآن ، حدیث ، صحابہ کرام ، اولیاء عظام اور مشہور مسلم اور غیر مسلم مصنفوں کے اقوال و افعال پر مشتمل ہیں یہ سب کے لئے یکساں مفید اور کار آمد ہیں ۔ ملاحظہ ہو ۔

(۱) خدا پر یقین ہی وہم و گماں کا موثر علاج ہے
(۲) اپنی تعریف کرنا سب سے بڑی جہالت ہے
(۳) ماں کی جہالت اور ناعاقبت اندیشانہ تعلیم سے سارے خاندان کا ستیاناس ہو جاتا ہے ۔
(۴) جہاد قوموں کی زندگی ہے ۔ جذبۂ جہاد کا فقدان بے غیرتی کی موت ہے ۔ (تجلیات سخن)
(۵) تقریر وہی کامیاب ہوتی ہے جو دل بہلانے سے زیادہ اپنے موضوع و مقصد کی وضاحت کرتی ہو
(۶) زندگی کامیاب بنانا چاہتے ہو تو اخلاق کو بلند کرو اور کردار کو پاکیزہ رکھو ۔
(۷) زندگی وقت کی سواری پر سوار ہے اس پر سنبھل کر بیٹھنے والا اپنی منزل پر ضرور پہنچتا ہے ۔
(چراغ علم و دانش)

انسان کی قابلیت اس کی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے ۔ (حضرت علیؓ)

دو چیزوں کو ہمیشہ یاد رکھو ۔ عبادت کرنا ، سخاوت کرنا دو چیزوں کو ہمیشہ بھول جاؤ ۔ جس سے تم نے نیکی کی ۔ جس نے تم کو بد دعا دی ۔ (حضرت محمدؐ)

چاند کے بغیر رات بے کار ہے اور علم کے بغیر ذہن

(سر سید احمد خاں)

(گلشن بے خزاں)

یہ چند نمونے ہیں اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس قدر مفید باتیں ان صفحات میں رقم ہیں

ٹی ایف فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

سیکڑوں چراغ | انسانی فطرت تاریک ماحول اور تاریک گھر کو کبھی پسند نہیں کرتی وہ تاریکی کو دور کرنے کے لئے لاکھ جتن کرتی ہے کبھی لکڑیاں جلاتی ہے اور کبھی آگ کے الاؤ روشن کرتی ہے اور کبھی دیئے اور چراغ جلاتی ہے اور اب اس جدید دور میں بجلی کے قمقموں سے کام لیتی ہے بجلی اور انسان لازم ملزوم ہو گئے ہیں۔

بجلی غائب ہوئی تو انسان بھی غائب ہو جاتا ہے اس کی مثالیں آئے دن اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں، اس عیب رشہود سے بچنے کے لیے اس نے جنریٹر بنائے ہیں اور اب ہر جگہ جنریٹر کی حکمرانی ہے تاہم جب جنریٹر کو بخار آجاتا ہے یا نزلہ آپکڑتا ہے تو پھر چراغ جلانا پڑتا ہے ایسے وقت انسان کی بے بسی دیدنی ہوتی ہے۔

ہائے رے انسان کی بے بسی!

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم بھی جدید دور میں داخل ہیں کیونکہ بجلی کے تار جو تمام جامعہ میں اور کمرے میں پھیلے ہوئے ہیں اس کے شاہد ہیں اور جنریٹر کا جدید نظام بھی ہمارے پاس ہے لیکن جیسے ہی سورج ڈوبتا ہے تاریکی جامعہ کو اپنے نرغے میں لے لیتی ہے اور کتاب اور حروف کی کیا بات ہے بورڈ تک اور طلبہ تک نظر نہیں آتے لیکن داد دیجیے ان بہادر طلبہ کی جو اس تاریکی کو دور کرنے کے لئے فوراً چراغ جلا دیتے ہیں، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں چراغ جل جاتے ہیں۔ خدا ان چراغوں کو تا قیامت جلائے رکھے اور ان کی روشنی سے سارے عالم کو جگمگائے۔

اشتیاق دانش فلاحی | اشتیاق دانش فلاحی جنہوں نے علی گڑھ سے انگریزی میں ایم اے کیا تھا اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر برطانیہ برج کے ادارے سے پہنچ چکے ہیں ان کی تحقیق کا موضوع شاید عیسائی مسلم تعلقات سے متعلق ہے۔ خدا ان کو کامیاب کرے اور دین کی خدمت کی توفیق دے آمین۔